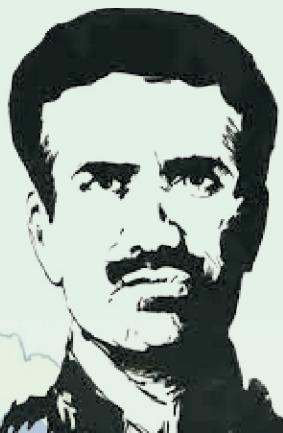


مقبول بٹ شہید کی پھانسی

اور

مہاترے کیس



مقبول بٹ شہید کی پھانسی

اور

مہاترے کیس

قیوم راجہ

Maqbool Butt's Hanging & Mhatre Case
by Qayyum Raja
Political Book
Awaz Publications
176p
ISBN: 978-969-7836-56-9

© جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

نام کتاب :	مقبول بٹ شہید کی پھانسی اور مہاترے کیس
مصنف :	قیوم راجہ
اہتمام :	محمود اظہر
ناشر :	آواز پبلیکیشنز
اقبال مارکیٹ، اقبال روڈ، کمپنی چوک، راولپنڈی	
تعداد :	1000
سالِ اشاعت :	2024ء
طبع :	محمود برادرز پرنٹرز
قیمت :	-/- 800 روپے

انتساب
دنیا بھر کے
راہِ حق کے مسافروں
کے نام

قیوم راجہ کی دیگر تصنیف:

- | | |
|------|--|
| 2009 | ۱۔ داستان عزم |
| 2012 | ۲۔ ترکی سفر کی ڈائری |
| 2013 | ۳۔ چھوٹی زندگی بڑی کہانی |
| 2016 | ۴۔ Islamic Approach to Diplomacy & Human Rights. |
| 2016 | ۵۔ حریت کا مسافر |

ترتیب

07	اکرم سہیل	آوازہ محیریت	○
08	رئیسہ غوری	وہ الفاظ کہاں سے لاوں؟	○
14	قیوم راجہ	حرف ابتداء	○
21	گرفتاری	پہلا باب	
28	اخلاقی و اعصابی قوت	دوسرا باب	
35	کیا پاکستان کے خلاف بھی جنگ کرو گے؟	تیسرا باب	
44	کھلی عدالت کا خفیہ فیصلہ	چوتھا باب	
55	خفیہ سزا کے بعد کی کہانی	پانچواں باب	
61	فرق مہم کا قیام	چھٹا باب	
70	عدالتوں کے تاریخی فیصلے	ساتواں باب	
76	رہائی کی نوید	آٹھواں باب	
83	خفیہ اداروں کی نگرانی میں پاکستان سے آزاد کشمیر کی طرف	نوواں باب	

90	قومی و بین الاقوامی خطابات اور اصلاحات	دسوال باب
97	مہاترے کیس میں گرفتار شدگان کا اختیار اور کردار	گیارواں باب
109	خاندانی اموات کا غم اور جہادی اکشافات	باہواں باب
115	عورتیں کیسے مردوں کو پسند کرتی ہیں؟	تیرھواں باب
123	برطانوی حکام اور عوام کیسے لوگوں کو پسند کرتے ہیں؟	چودھواں باب
127	مقبول ہٹ شہید کے ساتھی اور پیروکار	آخری باب
149	حرف آخر	O
151	دستاویزات	O

آوازِ حریت

اکرم سہیل

سابق سکریٹری تعلیم آزاد جموں کشمیر گورنمنٹ

قیوم راجہ تحریک آزادی کشمیر کے ایک عظیم حریت پسند رہنما ہیں جو اس قومی تحریک آزادی میں عملی حصہ لے رہے ہیں۔ جموں کشمیر کے عوام کو جزاً تھے پر سوار ہونے کے بجائے قومی آزادی کی تحریک کے لائجِ عمل کو مرتب کرنے کے لیے عقل و خرد کے استعمال کو فیصلوں کی بنیاد پر بحثتے ہیں۔

قیوم راجہ کی تحریکیں اس بات کو ثابت کرتی ہیں کہ قومی آزادی اور عوامی حقوق کی تحریکوں کو دشمن اتنے افغانستان نہیں پہنچاتا جتنا اپنوں کے عقل و شعور اور زمانے کے تقاضوں کو نظر انداز کر کے کیے گئے فیصلوں سے پہنچتا ہے۔

قیوم راجہ کی زیر نظر کتاب مشہور زمانہ مہاترے کیس کے ان تاریخی حقائق سے پہلی بار پرداہ ٹھاتی ہے اور قیوم راجہ اس کیس میں برطانیہ کی جیلوں میں جو مراکیں بھگتا پڑی ہیں وہ درحقیقت ان کا یہ جرم تھا کہ وہ مجرم راز درون میخانہ کے مصدق اس سارے عمل کو گہری نظر سے دیکھنے کا ادراک رکھتے تھے لیکن اس شعر کے مصدق اپنے موقف سے زرہ بھرنے ہتھے کہ:

اپنے بھی خنا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلائل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

وہ الفاظ کہاں سے لا اؤں؟

رئیسہ غوری
(کالم نگار)

کیا الفاظ ہوں کہ میں یہاں چھاپ دوں؟ کیا حروف چن کر جملے بناؤں جو اس جذبہ
حب الاطفی کا اک حصہ ہی بیان کر دے؟ کیسے الفاظ دھونڈوں جو اس محبت میں اٹھائے ہوئے وکھوں
پر مرہم کا کام کر سکیں؟ اسیری کے کرب کو میں محسوس کر سکتی ہوں مگر الفاظ کے محل کھڑے نہیں کر سکتی۔
لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں ہمارے ہیر و زیادتیں۔ میں کہتی ہوں کہ جس جذبے نے انہیں ہیر و بنایا وہ یاد
ہے کسی کو؟ کوئی مجھے آج کے تحریکی کارکنوں میں اس جذبے کی یقین دہانی کر سکتا ہے؟ کوئی مجھے کسی
کشمیری یا پاکستانی میں محبت کا یہ دریا دکھا سکتا ہے؟ سیاسی ٹھکوں کی تو میں بات ہی نہیں کرتی۔ خیر اللہ
ہی جزادے تو دے۔ ہم تو اس قرض کو دعاوں میں چکانے کا حوصلہ بھی نہیں رکھتے۔ صرف ۲۲ دن
کے تصور سے آدمی کا ناپ جاتا ہے لیکن انہوں نے تو ۲۲ سال دیا رغیر کی جبل میں گزارے ہیں۔ میری
پوری زندگی بھی ان کے ایک دن کی قیمت ادا نہیں کر سکتی۔ یہ داستان ہے سن ۱۹۸۱ میں جمنی کی آزاد
فضاؤں میں وطن کا درمیانوں کر کے جموں کشمیر لبریشن فرنٹ میں شامل ہونے والے ایک نوجوان کی
جنے دنیا قیوم راجہ کے نام سے جانتی ہے۔ جموں کشمیر لبریشن فرنٹ خود مختار کشمیری کی داعی جماعت
ہے۔ قیوم راجہ صاحب اپنی زندگی کی آخری سانس تک ریاستی وحدت کی بحالی کی تحریک سے وابستگی
کی تمنا کرتے ہیں۔ بقول راجہ صاحب انہیں اب تک ۳۲ سال کی اس وابستگی پر فخر ہے اور سکون قلب
بھی۔

ریاست جموں کشمیر کے اندر چل رہی موجودہ تحریک کا حقیقی جنم ۱۹۸۳ء کو

ہوا جب تھا جیل نیو ہلی میں مقبول بٹ شہید کو بھارت کی سفاک حکومت نے چھانی دے کر جیل کے اندر ہی فن کر دیا۔ اسی سیاسی، عسکری اور سفارتی جدوجہد کے تال میل نے پوری دنیا پر مسئلہ کشمیر اور کشمیریت کے اصل مدعے کو آشکار کیا۔ گزشتہ اتنا لیس برس سے جاری اس تحریک کے اندر لا تعداد لوگوں نے بے شمار مالی منفعت بھی حاصل کی اور ڈھیر سارے لوگ ایسے بھی ہیں جنکی ساری زندگی مادر وطن کی اس مقدس جدوجہد کی نذر ہوئی ہے اور وہ آج بھی خاموشی سے مقامی اور عالمی فورمز پر اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔

ریاست جموں کشمیر کی اس جدید تحریک میں انگلینڈ میں بھارتی سفارتکار روندر مہاترے اغواء اور بعد ازاں پر اسرار طور پر قتل ہو جاتا ہے۔ اغوا کنندگان کا مطالبہ تھا کہ بھارت مقبول بٹ کو چھانی دینے کا فیصلہ ترک کے انہیں بری کرے مگر بھارت اور برطانیہ نے گفت و شنید سے انکار کیا تو اغواء کے تین دن بعد ایک نوجوان مہاترے کے کوکی مار دیتا ہے۔ خبر گردش کرتی ہے کہ اس نے یہ کام امان اللہ خان کے کہنے پر کیا جس کی تصدیق قیوم راجہ بھی کرتے ہیں جن سے قاتل نے بعد میں معذرت کی کہ امان اللہ نے اس کے جذبے کا غلط فاہدہ اٹھایا اور وہ ناتحریب کاری میں یہ غلط کام کر بیٹھا۔ اب اسے اپنی غلطی کا احساس بھی ہو گیا ہے۔ مقبول بٹ شہید کی چھانی کا مسئلہ آج تک سیاسی اور سماجی حقوقوں میں ایک بحث بنا ہوا ہے۔ ایسا معمم جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنے اندر بہت ساری حقائیق سمیئے ہوئے ہے۔ قیوم راجہ صاحب مہاترے اغوا کیس کے سارے معاملے کا ایک متحک و مرکزی کردار ہیں جنہوں نے اس کیس کی پاداش میں انگلستان کی مختلف جیلوں میں ۲۲ برس تک اعصاب ٹکن جنگ لڑی ہے۔ ان کو اور ان کے ساتھ ریاض ملک کو محلی عدالت نے خفیہ سزا دے کر فائل وزیر داخلہ کے حوالے کر دی جس نے یہی انہیں کہ سزا بتانے سے انکار کیا بلکہ خفیہ طور پر قیوم راجہ کی نج کی تجویز کر دہ پندرہ سال سزا کو پچیس اور ریاض ملک کی بیس سال کر دی۔ لندن ہائی کورٹ نے اس خفیہ سزا کو کا عدم قرار دیا مگر کشمیری حریت پسندوں کو پھر بھی بری نہ کیا گیا جس کے نتیجے میں یورپ کی انسانی حقوق کی عدالت نے ریاض کو بیس اور قیوم راجہ کو ۲۲ سال بعد بری کر دیا۔ راجہ صاحب نے جیل میں رہتے ہوئے نفیات میں ماسٹر ڈگری حاصل کی۔ جیل انتظامیہ نے انہیں دریشن کے شکار قیدیوں کی کونسلنگ کی اجازت دی اور ٹریننگ سٹاف کو تھنی سٹی پر لیکھر مقرر کر دیا۔ انہوں نے اپنی رہائی کی جدوجہد کے ساتھ ساتھ قیدیوں کے حقوق کی جنگ بھی لڑی اور جیل بیٹیمیں ماؤل قیدی قرار پائے۔ رہائی کے بعد

بھی خاموشی سے نہیں بیٹھے بلکہ ایران اور ترکی میں جا کر وہاں کی پاریمیٹس کی توجہ میں مسلکہ کشمیر لایا۔ دراصل راجہ صاحب کی جہد مسلسل سے مزین ان کی پوری زندگی کسی پھر ہے ہوئے ساغر کی مانند اتنا وسیع قیوں رکھتی ہے کہ اس کو قرطاس کے سینے منتقل کرنے کے لیے خیم کتاب کی ضرورت ہے۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ ہمارے قلم میں اتنی سکت بھی نہیں ہے اور ہمارے الفاظ بھی اس عظیم نام اور کام کا حق ادا کرنے کے متحمل نہیں ہیں۔ ان کی آب یعنی پڑھکر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی گرفتاری کا سبب امان اللہ خان کے گھر سے پولیس کو ملنے والی قیوم راجہ کی تصاویر تھیں جبکہ امان اللہ خان نے اپنی فائلیں کسی اور مقام پر منتقل کر دی تھیں۔ ان دونوں یہ خبر بھی بہت گرم ہوئی کہ امان اللہ خان نے بھارتی سفارتخانہ لنڈن کو فون کر کے شالی کی پیشکش کر دی جس کے نتیجے میں پولیس نے انہیں گرفتار کر لیا اور معاملات بگڑنا شروع ہو گے۔ اسی ری کیا ہے اور آزادی کیا ہے؟ قیوم راجہ نے زندگی بھر کشمیری عوام کے مسائل اور خیالات کی ترجیحی کی ہے۔ سیاسی اعتبار سے جموں کشمیر لبریشن فرنٹ سے منسلک ہیں۔ بہت مختصر سا وقت جماعت اسلامی کو بھی دیا لیکن جلد ہی جماعت اسلامی کو خیر باد کہہ دیا اور واپس جموں کشمیر لبریشن فرنٹ میں چلے گئے بلکہ یہ کہنا درست ہو گا کہ انہوں نے عمر کا پیشتر حصہ لبریشن فرنٹ کے ساتھ وابستہ رہ کر بر کیا لیکن انہوں نے اپنے بیانات میں کئی بار یہ بھی کہا کہ کسی شخص کو جماعت کا اس وقت تک وفادار رہنا چاہیے جس وقت تک جماعت تحریک اور قوم کی وفادار ہے۔ انہوں نے ہر عہد میں سیاسی اور سماجی نا انصافیوں کے خلاف آواز بلند کی۔ قیوم راجہ صاحب کا زندگی بھر یہ الیمندرا ہے کہ وہ تاریکی کو روشنی اور باطل کو حق نہ کہہ سکے۔ وہ کہتے ہیں کہ جماعت اسلامی کے ساتھ ان کا اختلاف نہ ہی یا مسلکی نہیں بلکہ ان کی ناقابل عمل کشمیر پالیسی سے تھا۔ وہ اقوام متحده کی پانچ جنوری سن انجپاس کی بھارت یا پاکستان سے الماق کی قروداکو حق خود را دیت کی قرارداد ماننے کے لیے تیار نہیں۔ الماق کا راستہ ریاست جموں کشمیر کی وحدت کی بحالی نہیں بلکہ تلقیم کی طرف جاتا ہے۔

قیوم راجہ صاحب چند ایسے محکمین میں سے ہیں جن کی پیچان صرف ان کی طویل اسیری ہی نہیں بلکہ وہ اپنے نظریات اور گونا گوں شخصیت کی بنابر عالمی شہرت رکھتے ہیں۔ قیوم راجہ صاحب تحریک آزادی جموں کشمیر کے روح روائی سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی زندگی کے حالات انہیں ایک انسانیت پسند، ہمدرد اور ظلم کے خلاف آواز اٹھانے والے شخص کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں انقلابی خیالات اور انسانی ہمدردی کا امترانج پایا جاتا ہے۔ ان کی ہر تحریر و تقریر میں جبرا

و استعماری طاقتوں کے خلاف آوازِ اٹھتی نظر آتی ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ غنفوان شباب میں راجہ صاحب نگر گھونے ایک کھنڈرے نوجوان تھے لیکن ان کی داستان حیات یہ حقیقت اجاگر کرتی ہے کہ جب انسان کسی نیک امر کو مقصد حیات بنالے تو اس کی کایا پلٹ جاتی ہے۔ تحریک آزادی کشمیر کے لیے جس شعور کو ہمیں اجاگر کرنے کی خاص ضرورت ہے اس کے لیے سب سے پہلے اپنی سیاسی وابستگیاں ترک کرنی پڑیں گی اور خالص نظریہ پر ڈٹ جانا لازم ہوگا۔ آپ کا تعلق خواہ کسی بھی سیاسی جماعت سے ہو، اس کی ہربات آنکھ بند کر کے مان لینا کسی بھی صورت نظریہ کشمیر کے لیے سودمند نہیں ہوگا بلکہ جہاں آپ کی سیاسی جماعت نظریہ سے ہٹ کر کوئی قدم اٹھائے جس سے نظریہ کی ساکھ متاثر ہوا سکو ترک کرتے ہوئے خالص نظریاتی فکر کو مانتا لازمی ہوگا۔ جب تک ہم نظریہ کشمیر اور اس کے مفہوم کو صرف کسی سیاسی جماعت کی عینک لگا کر دیکھیں گے تو نظریہ کشمیر کی تصویر دھندا تی نظر آئے گی۔ ہمیں سیدھا راستہ اور درست سمت اختیار کرنے کے لیے سیاسی جماعتوں سے الگ ہو کر نظریہ کی ترویج اور اس پر عمل کرنا ہوگا۔ اس ہی میں ہماری جیت ہے۔

ریاست جموں کشمیر کی ملی۔ دینی، عسکری، سیاسی اور روحانی تاریخ میں ایسے گوہر نایاب نظر آتے ہیں جنکے تباہ و تباہ سے ہر کشمیری کا سرخرا سے بلند ہو جاتا ہے۔ ان میں بلند قامت نابغہ روزگار ہستیوں کا تذکرہ ہے جو نہ صرف ریاست بلکہ دنیا کے عالم میں اپنی سیاسی بصیرت، فکر و دانش، علم و حکمت اور فہم و فراست میں شہر آفاق انسٹ نفوذ کے حامل ہیں۔ ہماليہ سے بلند کردار اور انمول عمل ان شخصیات کا خاصا ہے۔ اس کے اثرات سمندر سے بھی گھرے ہیں۔ عصر موجود میں کشمیر کے سیاسی افق پر چھائی ہوئی تحریک آزادی کشمیر کے ساتھ والہانہ عقیدت اور بے پناہ محبت کی حامل شخصیات کا جب زکر کیا جاتا ہے تو دیگر حضرات کے ساتھ ساتھ قیوم راجہ اپنے جاندار کردار، کشمیر کی تحریک آزادی سے نظریاتی پختگی، علم و تجربہ، فکر و دانش سے ان کی شخصیت ابھر کر سامنے آ جاتی ہے۔ تحریک آزادی کے ساتھ بھر پور عزم ان کا مقصد حیات رہا ہے۔ خود ایک کارکن کی حیثیت سے عملی جد و جہد میں مظلوم کشمیریوں کی آواز بن گے۔ مجموعی طور پر وہ ایک فرد نہیں بلکہ انجمن و ادارہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ دنیا میں کہیں بھی کسی کے بھی اوپر ظلم ہو رہا ہوآ وازا بلند کرتے نظر آتے ہیں۔ قیوم راجہ صاحب اپنی سادگی، ہمدردی، اخلاص، مروت، معاف کرنے کے جذبے اور علم و دوستی و نظریاتی تعلیم و تربیت میں یکتا نے روزگار مرد کشمیری ہیں۔ ایک ہمہ جہت بلکہ شش جہت پہلو خصیت ہیں جنکے نامیں

میں حب الوطنی کا جذبہ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ ان کی ساری زندگی اسی مشن کے ساتھ گزری جس میں حوادث زمانہ میں اپنوں و پیگاؤں کی طرف سے نفتوں کے کئی طوفان آئے اور سازشوں کی آمدھیاں چلیں لیکن ان کے جذبوں اور حصولوں میں اعصابی اور نفسیاتی طور تنزل، تسلی، تبدل و تغیر پیدا نہیں کر سکیں بلکہ اس مرد آهن نے ہر آزمائش کو اپنے پختہ یقین و عزم کے ساتھ مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے یہ ثابت کر دیا کہ قدرت نے ان کی فطرت میں اپنے مقاصد کی نگہبانی کرنا شامل کر رکھا ہے۔

قیوم راجہ کی فکر میں صفائی اور عمل میں اعلیٰ ظرفی اور خطابت میں سیف زبانی ہے۔ وہ کشمیر کے ان پاک بازار اور اعلیٰ نفوس میں سے ایک ہیں کہ جن کے رُگ و ریشے میں آزادی کی فکر اس قدر حلول کر چکی ہے جو انہیں ہمہ وقت بے چین، بے قرار اور برس پیکار رکھتی ہے۔ وہ صفات اول کے ان کارکنان میں سے ہیں کہ جنہیں انقلاب کے مفہوم، ماہیت، نفیسات، حدود اربعہ، اہمیت، اختام، شرات اور اس کے تقاضوں کا دراک تھا۔ بلاشبہ آپ کی ساری کاشیں، کوششیں اور جدوجہد خالص اور فی سبیل اللہ ہے۔ قیوم راجہ صاحب اپنے سکون کو تح دے کر اپنی قوم کی بھلائی کو مقدم رکھنے کے روادر ہیں۔ وہ اپنے اندر ایک انجمن ہیں اور محکمین آزادی کشمیر کے دلوں کی دھڑکن ہیں۔ آپ کی آواز تکبیر مسلسل کی مانند ہے۔ کسی لیپاپوتی کے بجائے ہمہ جہت اور ہر محاذ پر جدوجہد اور ہمہ گیر تبدیلی ان کا مطبع نظر ہے۔ وہ مشکلات کو سینے سے لگانے کا ہنر جانتے ہیں اور وہ مصائب میں ملت کشمیر کی ڈھارس بندھانا بھی جانتے ہیں۔ وہ باطل پرستوں کے تحت طاؤس کی چوپیں ہلا کر رکھ دینے کے ہنر سے بھی واقف ہیں۔ قیوم راجہ صاحب کا آبائی علاقہ کھوئی رہا ہے۔۔۔ وہ عہد شباب سے ہی مقبول بٹ شہید کی رہائی کے لیے سیاسی و سفارتی جدو جہد میں مصروف رہے ہیں۔ مہاترے کیس میں سب سے طویل الوقت برطانوی اسیری دیکھی۔ تحریک آزادی کشمیر کے عظیم کارروائیں کا ایک عظیم راہی۔ جن لوگوں کی زندگی کشمیر کی آزادی کے خاربار میں آبلہ پائی کرتے ہوئے گزری، قیوم راجہ ان میں صفات اول کے مسافر اور منزل کے اولین راہی ہیں۔

قیوم راجہ صاحب جوں کشمیر بیشن فرنٹ کے سینکڑیوں میں سے ہیں اور اس جماعت کے ساتھ ان کی رفاقت عشروں پر محیط ہے۔ ان کی زندگی کا ایک سنہری حصہ زندگی میں گزرا ہے اس لیے وہ نفس کے رطب و پابس کا بھر پور شعور رکھتے ہیں۔ اپنے موقف اور عزم کے باعث قیوم راجہ

صاحب تحریک آزادی کشمیر میں نہایت احترام اور بے پناہ عقیدت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ قیوم راجہ صاحب میں تحریک آزادی کشمیر کے ساتھ والہانہ عشق، جدوجہد کی مقصدیت کا گہرا شعور، نشیب و فراز کا دراک، نوجوانان ملت کشمیر کے ساتھ مجتہ، حصول منزل کی فکر، دشمن کے منصوبوں پر گہری نظر، تحریکی لقدس کا احساس بدرجات موجود پایا جاتا ہے۔ یہ امر محتاج وضاحت نہیں کہ قیوم راجہ صاحب ظالمانہ سازشوں اور منصوبوں کو طشت از بام کر کے ان تمام چیزوں کو بے نقاب کرتے آئے ہیں جو مسئلہ کشمیر پر مکروہ فریب اور دھوکہ دہی سے کام لیتے رہے ہیں۔ وہ آج تک نہ صرف کشمیر کا ذکر کے حوالے سے بے لاغ اور بے باک رہے ہیں بلکہ وہ کشمیریوں کی تحریک کے سفارتی محاذ پر پاکستان کے حکمرانوں کی خوشنودی اور رضامندی یا خفیٰ اور ناراضگی کی پرواہ کیے بغیر راست اپروچ اور صحیح موقف اختیار کرتے رہے ہیں۔

گواں کتاب کے لیے منتخب کی گئی قیوم راجہ کی تحریروں کا تعلق مقبول بٹ شہید کی رہائی کی کوششوں کی ناکامی کی وجوہات، مہاترے کے اچانک قتل اور قیوم راجہ اور ریاض ملک کی خفیہ اور ماوارائے عدالت سزاویں سے ہے، یہاں قیوم راجہ کے اس موقف کا ذکر بھی ضروری ہے کہ جب تک کشمیری خود اعلیٰ سطح پر اپنی نمائندگی نہیں کرتے تب تک دنیا سے پاک۔ ہند تباہ سمجھ کر پاکستان کے بجائے ہندوستان کے موقف کی حمایت کرتی رہے گی۔ دو طرف جھگڑے نے مسئلہ کشمیر کو عالمی فورمز سے خارج کر دیا ہے۔ اس لیے پاکستان پر اسی اور حواری تلاش کر کے کشمیریوں کو تقسیم کرنے کے بجائے ان کو متعدد ہونے دے تاکہ وہ پوری ریاست جموں کشمیر کی نمائندگی اور اس کی وحدت کی بحالی کے لیے مشترکہ سیاسی و سفارتی جدوجہد کر سکیں۔ یہ وہ موقف ہے جسے ہر صاحب عقل و دانش اور باعمل ادمی جائز اور موثر سمجھتا ہے۔ قیوم راجہ صاحب نے دوران اسیری اور بعد از رہائی سیاسی، سماجی، تعلیمی اصلاحات اور سفارتی جدوجہد پر انگلنت مضامین ملکی وغیر ملکی اخبارات میں لکھے ہیں جو میں اس کتاب میں شامل کرنا چاہتی تھی لیکن ان کا مشورہ تھا کہ مقبول بٹ کی پھانسی، مہاترے کا قتل اور ان کی ماوارائے عدالت قید کا مسئلہ الگ رکھا جائے۔ اس لیے مساوائے چند ایک خطوط اور مضامین کے ان کے باقی سیاسی و سفارتی خطوط کا سی اور موقع پر انتخاب کیا جائے گا۔

حرفِ ابتداء

قارئین کرام! اس کتاب میں مقبول بٹ شہید کے ساتھ میرے روابط، ان کی رہائی کے لیے سیاسی، سفارتی اور عسکری کوششوں کی ناکامی کی وجوہات اور اس کے ذمہ داران،، مہاترے کے انگواء اور قتل کی مختصر روداد، ہماری ماورائے عدالت قید، رہائی اور لا زوال قربانیوں کے باوجود منزل سے کوسوو دوری کی وجوہات اور میرے چالیس سالہ تحریر کی تجربات کی روشنی میں تجربیہ اور آئندہ کے لائچھل کے لیے نوجوان نسل کے نام پیغام ہے۔ مقبول بٹ کی چھانی اور مہاترے کیس بٹ شہید کی ہر برپی پر ایک بحث کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ لوگوں کو اس بارے نقیوز اور گمراہ کیا گیا جس کی وجہ سے وہ مجھ سے تفصیلات اور وضاحت کی درخواست کرتے رہتے ہیں۔ بالآخر میں نے حقائق کو سامنے لانے کا فیصلہ کیا جن کو جاننا عوام کا حق ہے۔

برطانیہ میں قید کے دوران جیل کے دن اور جیل کی راتیں اور رہائی کے بعد حق گوئی اور سچ و صلح کے عنوان سے لکھے جانے والے میرے کالموں کو کتابی شکل دینے کا تصویر ایک متحرک اور پر جوش نوجوان خاتون رئیس غوری کا تھا۔ وہ کھوئی رہ سے چند کلو میٹر آگے فائر بندی لائن کی طرف گوڑا گاؤں سے تعلق رکھنے والے مولانا عرفان غوری صاحب کی صاحبرا دی اور ڈوگرہ دور میں جموں کشمیر کے پہلے مفتی اعظم مولانا عبدالکریم اور مہاراجہ کے دور میں ہی ایران اور جموں کشمیر کے درمیان روابط کے مترجم مولانا نظام الدین کی پڑپوتی ہیں۔ تحریر و مطالعہ کا گہرا شوق رکھتی ہیں۔ ایسی خواتین کو اگر موقع ملے تو وہ معاشرے کی بہتری کے لیے بہت کچھ کر سکتی ہیں۔ اس حقیقت کے باوجود کہ ہم برطانیہ میں قید تھے اور رئیس غوری نے کھوئی رہ سے میں غالباً ہماری قید کے دوران حتم لیا اور وہاں ہی پرورش پائی، وہ ہمارے کیس پر انگلیز میں موجود کئی تحریر کی کارکنوں سے زیادہ معلومات رکھتی ہیں جس کی وجہ ان کی تجربیاتی نظر، خاندانی تعلیم و تربیت، مسئلہ کشمیر میں ان کی لچکی اور تحریر کی تاریخ پر گرفت ہے۔ ان کی خواست تھی کہ میں ان کو اپنی ساری تحریریں دوں جنہیں وہ کتابی شکل میں مرتب کرنا چاہتی تھیں۔ چونکہ میں دوران قید اور بعد از رہائی سفر ناموں کے علاوہ مختلف سیاسی، سماجی اور نفسیاتی موضوعات پر لکھتا رہا ہوں، میں نے

مناسب سمجھا کہ مقبول بٹ کو پھانسی سے بچانے کی کوشش، مہاترے کیس اور اپنی قید کی کہانی اپنی باقی تحریروں سے الگ رکھوں تاکہ قارئین کو کیس سمجھنے میں آسانی رہے۔ اس لیے میں نے فی الحال صرف ان اشوز پر لکھی گئی تحریریں ان کو دیں۔ مقبول بٹ کی پھانسی اور مہاترے کیس سے پرده اٹھانا اس لیے بھی ضروری ہے کہ آج تک جس کسی نے کوئی رپورٹ لکھی ہے وہ یا تو اندازوں پر منی ہے یا تعصبات پر۔ ہاشم قریشی نے کافی حد تک سچ لکھا ہے لیکن وہ بھی صرف اتنا جانتے ہیں کہ مہاترے کو گولی مارنے کا حکم کس نے دیا جس کی بقول ہاشم قریشی انہوں نے خلافت کی تھی لیکن مہاترے کے انواء، قید خانے، اس کے ساتھ بات چیت، اس کی وزیر اعظم اور اگاندی کے نام مہاترے سے خلاکھوانے کے عمل اور مہاترے کے قتل کے وقت موقع پر صرف میں موجود تھا۔ اس کہانی کو از سرنو لکھنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ دوران ساعت تنظیم کو بچانے کی خاطر بے شمار سوالات پر میں نے خاموشی اختیار کی اور مجرمانہ کردار ادا کرنے والے عناصر نے گمراہ کن پروپیگنڈا کر کے تحریریک آزادی سے وابستہ لوگوں کو اتنا کنفیوڈ کیا ہے کہ لوگ مجھ سے طرح طرح کے سوالات کرتے ہیں کہ آخر آپ اصل حقائق سے پرده کیوں نہیں اٹھاتے؟ اب یہ بھی مناسب اور اپنی ذات کے ساتھ انصاف نہیں کہ میں قوم کے سامنے دوسروں کا تو دفاع کرتا رہوں لیکن اپنا دفاع کروں نہ اپنی پوزیشن واضح کروں۔ مہاترے کے قاتل نے کم از کم سوالات کرنے والے لوگوں کو اتنا تو ضرور کہا کہ قیوم راج قتل میں ملوث نہیں تھا لیکن اس کے باقی ساتھیوں نے ہر مقام پر قوم سے جھوٹ بولा۔ جیسا کہ اور زکر کیا، مہاترے کے قتل کے وقت میں موقع پر موجود تھا لیکن قاتل مسلح تھا جسے میں نے روکنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اس میں مہاترے کی بھی غلطی ہے کیونکہ اس نے قاتل پر حملہ کر دیا تھا اور اگر وہ بندوں چھین لیتا تو وہ ہم دونوں کو مار دیتا جس کی وجہ سے میں نے مہاترے کے کو دیوچ لیا اور قاتل نے اسے تین گولیاں مار دیں۔ اگر مہاترے قاتل پر حملہ نہ کرتا تو شاید میں قاتل کو اس سنگین اقدم سے روکنے میں کامیاب ہو جاتا لیکن مہاترے نے خوف سے یا ضرورت سے زیادہ بہادر بننے کی کوشش میں خود اپنی موت کو دعوت دے دی۔

اس سے قبل جب کبھی کسی محفل میں اپنی اسیری پر لکھی جانے والی پہلی دو کتابوں داستان عزم اور حریت کا مسافر پر بات چلی تو اکثر دوست کہتے کہ میں نے بہت ہی اختصار سے کام لیا ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ مقبول بٹ کی پھانسی اور ہماری خفیہ سزا کی داستان کے اندر اتنی داستیں چھپی ہیں کہ کسی ایک کتاب میں احاطہ ممکن ہی نہیں۔ دوسری پاکستان میں کتابوں کے معاوضے کا رواج ہی نہیں ہے جس کی وجہ سے کئی اہم حقائق منظر عام پر نہیں آتے۔ دوران اسیری اسی کتاب کا برطانیہ میں مجھے

بھاری معاوضے کی پیشش ہوئی تھی لیکن شرط یہ تھی کہ میں کسی راز کو ازندہ رکھوں۔ ایسا کرنے سے مزید گرفتاریاں ناگزیر اور ہماری جماعت جموں کشمیر بریشن فرنٹ کے بینڈ ہو جانے کا بھی خطرہ تھا۔ جن لوگوں کو ہم نے گرفتار ہونے سے بچایا ان میں سے ایک نے اخلاقی جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے اعتراض کیا کہ مہاترے کو قتل کرنا سنگین غلطی تھی جس کی وجہ سے مقبول بٹ کی رہائی کی کوشش میں ناکامی ہوئی اور ہم بھی اندر ہیرے میں رہ کر اپنا دفاع نہ کر سکے لیکن فرار ہونے والے کچھ افراد کے ظرف کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اپنی غلطی تسلیم کرنے اور ان کو بچانے کی ہماری کوششوں کا شکر یہ ادا کرنے کے بجائے الثانجی مغلبوں میں کہا کہ قیوم راجہ نے امان اللہ خان کے مشورے پر شہرت کی خاطر گرفتاری دی حالانکہ میں نے باضابطہ طور پر بریشن فرنٹ کی سینٹرل کمیٹی سے مہاترے کیس کو سبوتاً ثکرنے کی انگوائری کی درخواست دی تھی جس کا آج بھی بریشن فرنٹ کی فالکوں میں ریکارڈ موجود ہے۔ اس انگوائری کو تنظیمی نقصان قرار دے کر روک دیا گیا تھا جبکہ انہی لوگوں نے ذاتی اختلافات کی وجہ سے آزادی کی سب سے بڑی جماعت کو کئی دھڑوں میں تقسیم کر کے ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ منفی پروپیگنڈا کرنے والوں میں سے ایک اسلام مرزا جب امریکہ سے بیس سال بعد گرفتار ہواتو میں نے پھر بھی اس کے ایک رشتہ دار جو بفضل خدا بھی حیات ہیں، کو جبل میں بلا کر کہا کہ میں نے بتایا کہ پولیس بار بار جبل میں آ کر مجھے بلیک میں کرنے کی کوشش کر رہی ہے لیکن میں پولیس کو کوئی بیان نہیں دوں گا اور اسلام کو میرا پیغام دیں کہ وہ خود بھی خاموش رہے تو وہ بخ جائے گا۔ اس کے باوجود وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا۔ اس منفی پروپیگنڈے کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ مہاترے کو انغو اکر کے پاکستان بھاگ آیا اور اب اس کے پاس لوگوں کے اس سوال کا بھی کوئی جواب نہیں تھا کہ مہاترے کو انغو اکر کے وہ خود کیوں پاکستان بھاگ آیا جبکہ ہم نے سینٹرل لیا جس کی وجہ سے لوگ ہماری حمایت کرنے لگے جو اسے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ میں نے بریشن فرنٹ کی سینٹرل کمیٹی سے درخواست کی تھی کہ امان اللہ خان بتائیں کہ اگر مہاترے کے اخواء کا مقصد مقبول بٹ کو پھانسی سے بچانا تھا تو پھر گفت و شنید شروع ہونے سے پہلے ہی تین دن بعد اسے قتل کیوں کروا دیا؟ ہمارے بارے اس منفی پروپیگنڈے سے ایک عام شخص تو درکنار سیکرٹری گورنمنٹ کے منصب سے ریٹائر ہونے والے شوکت مجید ملک بھی متاثر ہوئے بنانہ رہ سکے۔ سابق صدر آزاد کشمیر کے ایج خور شید مرحوم کی برسی کے موقع پر انہوں نے میری موجودگی میں کہا کہ دراصل قیوم راجہ صاحب مہاترے کیس میں ملوث نہیں تھے لیکن امان اللہ خان کے مشورے پر شہرت کی خاطر گرفتاری دے

دی۔ شوکت مجید کی گفتگو پر جب میں نے اعتراض کیا تو کہنے لگے اچھا ایسا نہیں ہوا تھا؟ مجھے منفی پروپیگنڈا کرنے والوں کی نسبت شوکت مجید کی گفتگو پر زیادہ افسوس ہوا کہ آخراتنے بڑے منصب پر فائز رہنے والے شخص کی اپنی سوچ کیا اور انداز گفتگو کیسا ہے؟ بحال قومی کاز کی خاطر بہت کچھ سہنا اور برداشت کرنا پڑتا ہے۔ میں نے اس موقع پر بھی اخلاق کے دائرے میں رہ کر شوکت مجید کو جواب دیا۔ یورپ میں انسانوں کے ذاتی تحریکات کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ مہاترے کیس کی کہانی جیل سے لکھنے کے لیے مجھے یقین دلا یا گیا کہ صفحہ رقم کتاب کا مسودہ دیکھ کر اور باقی کتاب شائع کرتے وقت دے دیا جائے گا۔ سارے راز فاش کرنے پر میں آج یہاں سے بھی کتاب لکھ سکتا ہوں اور یہاں روزگاری کے عالم میں مجھے پیسوں کی ضرورت بھی ہے لیکن میرے لیے آج بھی تحریک و تنظیم کا مقاومہ زیادہ عزیز ہے۔ اس وقت بہت تکلیف ہوتی ہے جب ہم کہتے ہیں کہ وہ تحریک و تنظیم جس کی خاطر ہم نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا اور مقبول بٹ کو پھانسی ہو گئی اس بٹ کا نام تو بہت استعمال کیا جاتا ہے لیکن مقبول بٹ اور مہاترے کیس کے حقائق کو توبانے کی کوشش کی جا رہی ہے مگر چھوٹے چھوٹے مفادات اور ذاتی عناد کی خاطر جماعت کو تقسیم کر دیا گیا اور تحریک کو مرشل کمپنی بنادیا گیا۔ ہماری رہائی کی مہم میں اہم کردار ادا کرنے والے رکنی پارلیمنٹ ڈاکٹر برائے ایڈن نے ایک کتاب بعنوان سائنس اور سیاست لکھی ہے جس میں انہوں نے ایک باب ہماری اسیری پر بھی لکھا ہے جس میں انہوں نے ہمارے ساتھ برطانوی حکومت کے ماوراء عدالت فیصلوں اور اس کے خلاف ہماری حمایت اور مسئلہ کشمیر کا بھی زکر کیا۔ اس عظیم پارلیمنٹرین نے اپنی کتاب کے ابتداء میں لکھا کہ انہوں نے پارلیمنٹ میں تقریب رونمائی کے بجائے اس سکول میں تقریب منعقد کی جس میں انہوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی کیونکہ اگر ایک بھی بچے کو ان پریشان مل گئی تو وہ سمجھیں گے کہ کتاب لکھنے کا مقصد پورا ہو گیا ہے۔ میں نے بھی آج تک جو لکھا ہیکی ذہن میں رکھ کر لکھا اور نہ اگر معاوضہ اور پبلیٹی مقصد ہوتے تو یہ کتاب برطانیہ میں انگلش زبان میں شائع کرواتا۔ جن کرداروں کو اب میں نے زیر بحث لایا ہے اگر وہ دروغ گوئی اور منفی پروپیگنڈا کے کوئے نوجوانوں کو گمراہ نہ کرتے تو میں انکے بارے اتنا بھی نہ لکھتا لیکن اب نوجوان نسل کے ذہنوں میں جو کنیوژن ہے اسے دور کرنا ضروری ہے تاکہ مستقبل میں بہتر لاجھ طے کرنے کے لیے انہیں آسانی ہو اور وہ کسی دھوکے میں نہ آئیں۔

جدید تحریک کے بانی، عملی جدوجہد کی عظیم مثال اور اپنے قول و فعل میں توازن رکھنے والے ایک نئیس انسان مقبول بٹ شہید کے ساتھ میراپبلار ابٹے ۱۹۸۳ میں اس وقت ہوا جب میں دو

پڑواں ملکوں جمنی اور فرانس میں رہائش پذیر تھا۔ میرے سوہن راجچوت قبیلے کے کچھ لوگ جموں کشمیر لبریشن لیگ اور کچھ مسلم کافرنس میں تھے۔ میری ہمدردیاں لبریشن لیگ کے ساتھ تھیں لیکن ابھی کوئی عملی کردار ادا کرنے والی عمر نہ تھی کہ میں ہالینڈ اپنے بھائی نذیر احمد صاحب کے پاس چلا گیا۔ بھٹو نے زبردستی لبریشن لیگ کو پیپلز پارٹی میں شامل کروالیا تھا جس کے نتیجے میں ہمارا سارا خاندان مسلم کافرنس میں چلا گیا لیکن میں عملی سیاست سے دور رہا۔ جرمی میں لنڈن سے اخبار وطن آیا کرتا تھا جس کے ایڈیٹر چناری سے تعلق رکھنے والے علی کیانی تھے جو میری گرفتاری کے بعد رہائی تک میرے ہبھتریں ہمدردان اور معاوین میں شامل رہے۔ علی کیانی بیکا تعلق پی پی سے تھا لیکن ان کی روح آزادی پسند تھی۔ انہوں نے مقبول بٹ شہید کی ۱۶ سالہ بیٹی بنی بٹ کا ایک انٹرو یو شائع کیا جس میں انہوں نے کشمیری نوجوانوں سے سوال کیا کہ وہ ان کے ابوکو پھانسی سے بچانے کے لیے کیا کر رہے ہیں؟ یہ انٹرو یو پڑھ کر میں ایمنسٹی انٹریشنل کی جرمی برائی اور دوسرا کئی انسانی حقوق کے اداروں کے پاس گیا۔ جرمی بیش سے بھی بھارتی حکومت کے نام اپبلن بھجوائی۔ امان اللہ خان کو ہماری سرگرمیوں کا علم ہوا تو وہ برطانیہ سے نہیں ملنے آئے۔ انہوں نے سٹھنگارٹ جرمی کی شاخ کا باقاعدہ قائم عمل میں لا یا جس کا مجھے پہلا صدر اور یونس کیانی کو جزل سیکرٹری منتخب کیا گیا۔ پاکستانی کمیونٹی نے سخت مخالفت کی مگر ہم ڈٹے رہے۔ امان اللہ خان کی سیاسی سوچ اور تنظیم کے اندر تربیت کے طریقہ کار کا ہمیں اس وقت کچھ اندازہ ہوا جب انہوں نے ہم سے مشورہ کیے بغیر کچھ ایسے نوجوانوں کو بھی ورکنگ کمیٹی میں شامل کر لیا جن کی راتیں شراب خانوں میں گزر کرتی تھیں۔ لبریشن لیگ سے تعلق رکھنے والے کوٹی کے ایک سابق بنک افیسر ملک لطیف صاحب اور چند دوسرے دوستوں نے مجھ سے شکایت کی تو میں نے کہا کہ یہ نوجوان امان اللہ خان کے پاس تھوڑی دیر بیٹھے تو تھے مگر مجھے امان اللہ خان نے نہیں بتایا کہ ان کو ورکنگ کمیٹی میں شامل کیا گیا ہے۔ دوسری حیرت اس وقت ہوئی جب امان اللہ خان کے لنڈن واپس جانے کے چند دن بعد کوٹی شہر کا عبد الکریم بٹ جو مجھ سے عمر میں کافی بڑا تھا، میرے پاس آیا اور کہا کہ وہ ایک اپریشن کرنے لگا ہے اور اگر گرفتار ہو گیا تو مجھے اس کی مدد کرنی ہوگی۔ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ امان اللہ خان نے اسے جرمی میں ایک بھارتی سفارت کا گولی مارنے کا کہا ہے۔ میرے دوسرے سوال کے جواب میں اس نے کہا اس کا مقصد مقبول بٹ کی رہائی کے لیے بھارت پر دباؤ ڈالنا تھا۔ میں نے اسے یہ کہہ کر روک دیا کہ گولی مارنے سے دباو نہیں پڑھے گا بلکہ مسائل پیدا ہوں گے۔ کریم بٹ نے میرا مشورہ مان لیا۔ کریم بٹ پر میں اس لیے اعتماد کرتا تھا کہ

وہ مقبول بٹ شہید کے قریب رہا تھا اور ان کے ساتھ بھارتی مقبولہ کشمیر جانے والا تھا مگر کسی وجہ سے مقبول بٹ شہید دوسرے دونوں جوانوں حمید بٹ اور ریاض ڈار کو ساتھ لے گئے تھے۔

امان اللہ خان کے ان اٹی پن کا تیسرا تجربہ تب ہوا جب مارچ ۱۹۸۳ء میں انہوں نے کہا کہ مقبول بٹ کی رہائی کے لیے ایک ٹیم بھارت بھیجنی ہے۔ دونوں جوان انہوں نے برطانیہ سے تیار کیے ہیں، ایک فرانس سے اور ایک مچھ سے مانگا۔ میں نے پیرس میں رہائش پزیر ڈیال سے قلعن رکھنے والے خواجہ محمد عظم عرف خواجہ سروکوتیار کیا جو ایک تربیت یافتہ دلیر نوجوان تھا۔ فلاٹ سے چند گھنٹے قبل امان اللہ خان نے مجھے انتہائی پریشانی کے عالم میں فون کیا کہ ان کا فرانس والا ادی عین موقع پر دھوکہ دے گیا ہے اور میں کسی اور نوجوان کو تیار کروں۔ میں نے کہا اتنے کم وقت میں کسی بندے کو تیار کرنا مشکل ہے۔ کہنے لگے دوسرے تینوں کی رہنمائی کے لیے پھر آپ خود تیار ہو جائیں۔ میں نے غلط کیا یا صحیح، میں تیار ہو گیا۔ میں نے اپنی ٹکٹ پیرس ائر پورٹ پر برٹش ائر ویپر سے وصول کی۔ خواجہ سروکوت اس تھلیا اور پیرس سے لندن چلے گئے جہاں ہم دوسرے دونوں جوانوں کے ساتھ ہباز میں ملے۔ سعودی عرب سے ہم نے ائر انڈیا پر بھارت کے لیے سوار ہونا تھا۔ لندن سے فلاٹی ہونے کے بعد جب میں نے ٹکٹ چیک کی تو جی ان رہ گیا کہ وہ دون و تھی۔ سعودی عرب میں بورڈنگ کے وقت ائر انڈیا کے ایک افسر نے یہ کہہ کر مجھے روک لیا کہ میری پیدائش پی او کے میں ہوئی ہے البتہ جب اس نے وہ ٹکٹ پر اعتراض کیا تو میں نے اسے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ واپسی پر میں باقی روڑ پاکستان جاؤں گا اور وہاں سے جب واپس پیرس جانا ہو تو ٹکٹ لے لوں گا۔

مذکورہ تین تجربات کی وجہ سے میں نے دوستوں کو بتا دیا کہ ائنہ امان اللہ خان کے کسی پلان میں میں شامل نہیں ہوں گا۔ مقبول بٹ کی رہائی کی آخری کوشش کے طور پر مہاترے کے سینئر کے انخواہ کی جب بات چلی تو تمام ساتھیوں نے کہا کہ امان اللہ خان کو اس کا علم نہیں لیکن بعد میں یہ جھوٹ ثابت ہوا۔ مہاترے کے انخواہ کی وجہ یہ تھی کہ اس کا سینئر عین موقع پر موجود نہ پایا گیا تو انخواہ کندگان نے مہاترے کو اٹھا لیا۔ یوں تو بہت منفی پروپیگنڈا ہوا کہ مہاترے ایک ٹکر تھا جس کی مقبول نٹ کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہ تھی لیکن حقیقت میں وہ ایک سینئر سفارتکار تھا جس کا ذکر جھنٹ میں بھی ہے۔ ۱۹۷۶ء میں پبلک سروس کمیشن کا متحان پاس کر کے سفارتی کمیونٹی کا رکن بننا۔ پہلی تعیناتی بٹکھے دیش، دوسری تھر ان اور تیسرا برطانیہ تھی۔ انخواہ کے وقت مہاترے ڈپٹی کمشنر تھا جس کا اس کتاب کے آخر میں جھنٹ کی ایک کاپی میں زکر موجود ہے۔ مہاترے کی بیگم ایک داکٹر تھیں جو

مہاترے کو گھر سے پرہیزی کھانا دیا کرتی تھی۔ نقادوں نے یہ مذاق بھی اڑایا کہ یہ کیسا سفارتکار ہے جو گھر سے ڈبے میں کھانا لے کر جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کو بھی کہا جاسکتا ہے کہ تم اور تمہارے علماء جس اسلامی سادگی کا ورد کرتے ہیں دوسروں قومیں اس پر عمل کر کے تم سے بہت آگے نکل گئی ہیں جبکہ تم تصادمات کا شکار ہوا۔ گولی مارنے والے نے گولی مارنے کے بعد اعتراف کیا کہ امان اللہ خان اور اسلام مرزا ملے ہوئے تھے جنہوں نے اسے (گن مین) بھی دھوکہ دیا۔ اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ گن مین کے ساتھ رہائی کے بعد اطمینان کے ساتھ تفصیلی گفتگو ہوئی تو میں نے اسے پوچھا کہ ٹھیک ہے تم نے اپنی ظلطی تعلیم کی لیکن تمہارے نزدیک امان اللہ نے تم سے ایسا جرم کیوں کروایا اور مہاترے کے انواع کے بعد اس نے کیوں بھارتی ہائی کمیشن کو شاشی کی پیشکش کر دی جبکہ اسے خاموش رہ کر صورت حال کا جائزہ لینا تھا۔ گن مین نے بھی سانس لیتے ہوئے کہا مان اللہ نے اس کے خلوص کا غلط فائدہ اٹھایا۔ وہ مخلص تھا مگر کم عمری اور ناجربکاری میں مار کھا گیا۔ اس نے کہا امان اللہ خان نے جان بوجھ کر کیس سبوتاش کیا ہے۔ مجھے گن مین کے تجزیہ سے اتفاق ہے کیونکہ پلان بی کے مطابق سفارتکار کی جان کے عوض مقبول بٹ کی پھانسی کی سزا عمر قید میں تبدیل کر کے انہیں سریغر جیل منتقل کیے جانے کا مطالبہ کیا جانا تھا لیکن امان اللہ خان کو مہاترے کی موت کی جلدی تھی۔ امان اللہ خان کے خلاف میرا مقدمہ فرنٹ کی سینیٹ کمیٹی میں یونس تریابی صاحب نے پیش کیا جس کی مفصل روپورٹ ان کی کتاب مائنڈ الجید اور برطانوی کشمیر یوں کی انقلابی جدوجہد میں بھی شامل ہے فرنٹ کے اس وقت کے صدر افضل جاتلوئی نے مقدمے کی صحت قبول کرنے کے باوجود تنظیمی مفاد کے نام پر بحث نہ ہونے دی۔ اگر اس وقت بحث ہو جاتی تو آج چالیس سال بعد بھی ختم نہ ہونے والی بحث کا یہ سلسلہ جاری نہ رہتا۔ امان اللہ خان اور افضل جاتلوئی دنیا سے چلے گئے ہیں اور ہم نے بھی رخصت ہو جانا ہے لیکن کچھ غلطیاں ایسی ہوتی ہیں جو قبر میں بھی پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ یہ بھی ایسی ہی ایک غلطی تھی۔

قیوم راجہ

0304-515003/0370-9144566.
Email:aqraja75@gmail.com

گرفتاری

۲۲ فروری سن چر اسی میری زندگی کو ہمیشہ کے لیے بدل دینے والا دن تھا۔ اس دن میں ہولی حصہ بندراگاہ پر برستہ آر لینڈ جاتے ہوئے گرفتار ہو گیا تھا۔ اس روٹ کا مشورہ مجھے امان اللہ خان نے دیا تھا جنکا کہنا تھا کہ ان کے بہنوئی آر لینڈ میں ڈاکٹر ہیں۔ اس راستے پر آنے جانے کی وجہ سے انہیں معلوم ہے کہ یہ راستہ محفوظ ہے لیکن یہ انتہائی خطرناک تھا کیونکہ آر لینڈ اور برطانیہ کے درمیان شالی آر لینڈ کا تناذع ہے۔ میں بولٹن سے برستہ یورپول تکنے والا تھا کہ امان اللہ خان نے پیغام بھیجا کہ میرا پاسپورٹ تیار ہو گیا ہے اور میں لوٹن آ جاؤں۔ میں نے سوچا اگر پاسپورٹ تیار ہو گیا ہے تو پھر بولٹن سے کسی اور کا پاسپورٹ استعمال کر کے اس کو بھی رسک میں ڈالنا چھپی بات نہیں اس لیے میں نے لوٹن اپنے کزن اسحاق خان کے گھر آ کر امان اللہ خان کو اطلاع دی کہ میں آ گیا ہوں اور بنوایا گیا جعلی پاسپورٹ مجھے بھیج دیں۔ امان اللہ خان نے ہاشم قریشی کو مجھے ملنے کے لیے بھیجا جس نے کہا کہ بدھا تو پاگل ہو گیا ہے۔ ہاشم قریشی جب لہر میں ہوتے تو امان اللہ کو بدھا کہتا تھے۔ میں نے جب سوالیہ نظروں سے دیکھا تو ہاشم قریشی نے کہا امان اللہ خان کہتے ہیں کہ راجہ کو بولو کہ گرفتاری دے۔ پوری کشیری قوم اس کے پیچھے ہو جائے گی۔ میں نے کہا یہ پنڈی والا راجہ بازار نہیں۔ برطانیہ کے اندر ایک بھارتی سفارتکار کا قتل ہے۔ ہاشم نے کہا امان اللہ کہتا ہے کہ لوٹن میں ہمارا دفتر ہونے کی وجہ سے یہاں پولیس کا خطرہ ہے اس لیے میں قریبی شہر پہنچ چلا جاؤں جہاں مجھے پاسپورٹ بھجوادیا جائے گا۔ پاسپورٹ کے بجائے دس دن بعد میرا کزن اسحاق آیا جس نے کہا کہ

امان اللہ خان کہتے ہیں کہ جس ادی نے پاسپورٹ کا وعدہ کیا تھا وہ وعدہ پورا نہ کر سکا اس لیے اب میں اسحاق کے وزٹر پاسپورٹ پر نکلا جاؤں۔ اس مقصد کے لیے میری تصاویر بنائی گئیں۔ اب نئے روپ میں بنائی گئیں میری تصاویر صرف امان اللہ خان اور اسحاق کے پاس تھیں۔ جب میں اسحاق کے پاسپورٹ پر ہوئی ہیڈ بندراگاہ پر بعد ریعہ ٹرین پہنچا جہاں سے میں نے شب پر سورا ہونا تھا تو مسافروں کی قطار سے مجھے نکال کر پاسپورٹ طلب کیا گیا۔ میں نے اسحاق کے نام سے بنایا گیا پاسپورٹ سول کپڑوں میں ملبوس افسر کو دیا جس نے عقبی کمرے میں جا کر جائزہ لیا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ اس افسر کے پاس پہلے بھی میری تازہ تصاویر تھیں۔ میری تازہ تصاویر صرف امان اللہ خان اور اسحاق کے پاس تھیں۔ پلیس نے مجھے ایک کمرے میں بند کر دیا۔ واضح ہو چکا تھا کہ میرے غافل مخبری ہوئی ہے اور مجرم امان اللہ خان ہے ہے جب پتہ چلا کہ میں بلوٹن سے نکلنے والا ہوں تو پاسپورٹ تیار کر لینے کا جھوٹ بول کر مجھے پہلے بلوٹن بلا یا پھر کہا کہ جس نے پاسپورٹ دینا تھا وہ ڈر گیا اور آخر میں میرے ہی کزن کو پاسپورٹ دینے پر مجبور کیا جس کی تصاویر میرے پہنچنے سے پہلے امیگریشن ڈیک پہنچ گئیں۔ میری یہ تصاویر دو مرتبہ نوائی گئیں۔ پہلی مرتبہ یا لیاقت نامی ادی کے پاسپورٹ پر میری تصویر لگوانے کے لیے اور پھر دوسری دفعہ اسحاق کے پاسپورٹ پر۔ پہلی تصاویر بارے کہا کہ جس ادی کو میری تصاویر اور لیاقت کا پاسپورٹ دیا اس سے واپس نہیں ملیں اور دوسری بار جو بنا سیں وہ اسحاق کے پاسپورٹ کے لیے تھیں۔ اب صاحب عقل خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ میری تصاویر میرے ہوئی ہیڈ پہنچنے سے پہلے وہاں کیسے پہنچیں؟ جامہ تلاشی اور خالی پستول بندراگاہ کے ایک کمرے میں لے جا کر سب سے پہلے میری جامہ تلاشی لی گئی اور پھر میرا سرسری سا انٹری یوکیا گیا۔ چونکہ میں اسحاق کے پاسپورٹ پر سفر کر رہا تھا، جب مجھے کام اور گھر کا پوچھا گیا تو میں نے سب کچھ اسحاق بکر جواب دیا لیکن میں سمجھ گیا تھا کہ مجھے پہنچا دیا گیا ہے۔ وقت تو گزر چکا تھا لیکن پھر بھی میں بہت زیادہ محتاط ہو گیا تھا اس لیے پلیس نے جامہ تلاشی کے دوران اپنی پستول میرے سامنے میز پر رکھی تو مجھے شک گزرا کہ یہ خالی ہو گی اور شاید پلیس چاہتی ہے کہ میں پستول اٹھا کر پلیس پر تان لوں۔ پستول خالی ہو گی اور پلیس مجھے آسانی سے قابو کر کے بعد میں الزام لگائے گی کہ یہ پستول بھی

مجھ سے برآمد ہوئی ہے۔ جب میں پستول اٹھاتا تو یقیناً اس پر میرے فنگر پرنٹ آ جاتے جنہیں پولیس ثبوت کے طور پر استعمال کرتی۔ میرا یہ شک اس وقت تھیں میں بدلتا گیا جب پولیس پستول میز پر چھوڑ کر سیل سے باز نکل گئی۔ جو افسروں پس آیا اس نے سب سے پہلے میز پر پڑی پستول پر نظر ڈالی اور کہا اور مائی گاڑ میں اپنی پستول بھول گیا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا پتھر مجھے اپنوں نے دھوکہ دیا ہے تم نہیں دے سکتے! رات کو مجھے ایک سیل میں بغیر بستر، پانی اور روٹی رکھا گیا۔ یورپ کے انتہائی سرد دن و رات تھے لیکن ہم بھی جوان تھے سو وقت کٹ ہی گیا۔

تفصیش کا باقا نکدہ آغاز

۲۳ فروری سن چر اسی صبح نوبجے کے قریب مجھے سیل سے نکال کر ایک دفتر میں لے جایا گیا۔ داخلی دروازے کے بالکل سامنے ایک طویل القامت مرد بیٹھا ہوا تھا۔ دروازے کے عین سامنے بیٹھنے کی شاید وجہ یہ تھی کہ جب میں داخل ہوں تو وہ میرا چھپی طرح اجازہ لے سکے۔ اس نے بڑے احترام سے مجھے کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ یہ نفیتی داؤ تھا۔ اس افسر نے اپنا نام چیف سپر نیشنل سپیک بتاتے ہوئے مجھے میرا نام پوچھا۔ پھر ساتھ ہی کہا اپنے سارے نام اور اصلی نام بھی بتاؤ۔ میں نے کہا ایک ادمی کا ایک ہی نام ہوتا ہے۔ اس نے کہا نہیں بعض اوقات لوگ زیادہ نام بھی اختیار کر لیتے ہیں جیسا کہ آپ نے کیا۔ اب مجھے اپنا اصلی نام بتاؤ جو تمہارے پاسپورٹ پر ہے۔ مجھے معلوم تھا اب غلط بیانی کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ پولیس نے میرا اصلی پاسپورٹ ہوم آفس سے حاصل کر لیا ہے۔ میں نے کہا عبدالقیوم راجہ۔ میرے پیچھے بیٹھا ہوا ایک اور افسر بولا میرا نام جان ران براون ہے۔ میں چیف انسپکٹر ہوں۔ اس نے میرے سامنے ایک کاغذ رکھ کر پاسپورٹ پر کیے جانے والے دھنخط کرنے کے لیے کہا جو میں نے کیے تو اس نے اپنی جیب سے میرا پاکستانی پاسپورٹ نکال کر دھنخط نہیں کیے۔ اس نے مجھے ڈمکی دی کہ اب اگر میں تعاون نہ کرو گا تو مجھے اسکا خمیازہ بھگتا پڑے گا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اب وہ مجھے مہاترے کیس میں میرے کردار اور اس میں ملوث دوسرے ساتھیوں کا پوچھیں گے۔ چیف نے کہا اپکو معلوم ہے چند ہفتے قبل شہیر کے حوالے سے برمنگھم میں کیا ہوا ہے۔ آپ اس بارے کیا جانتے ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ اب میں تو نہیں بچ سکتا لیکن

میں دوسرے ساتھیوں اور اپنی جماعت جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کو کیسے بچاؤں گا۔ میرے بس میں ایک ہی بات تھی کہ جتنا ہو سکے پولیس کا وقت ضائع کروں تاکہ باقی ساتھی بھاگ جائیں۔ میں نے کہا میں کوئی متحرک سیاسی کارکن نہیں ہوں۔ چیف نے کہا دیکھو، ہم نے تمہارے سیاسی پس منظر کی ساری معلومات حاصل کر لی ہے۔ امان اللہ خان کے گھر سے جو دستاویزات ملی ہیں ان کے مطابق تم لبریشن فرنٹ کی سینیٹر قیادت میں شمار کیے جاتے ہو۔ کشمیر لبریشن اری نے برمنگھم میں بھارتی سفارتکار مہاترے انگواء اور قتل کیا جس کی شاثی کے لیے لبریشن اری نے لبریشن فرنٹ کا انتخاب کیا۔ اتنا بڑا واقعہ ہوا اور تم کہتے ہو پتہ نہیں۔ اس نے کہا تم بھی ملوث تھے اور جو تمہارے ساتھ تھے ان کے بھی نام بتاؤ۔ میں خاموش رہا۔ چیف نے مجھے سکرٹ پیش کیا۔ میں نے کہا میں سکرٹ نہیں پیتا۔ اس نے کہا اچھا لمحیک ہے اب ہم تمہیں برمنگھم لے کر چلتے ہیں۔ وہاں تفتیش دوبارہ شروع ہو گی۔ درجن بر پولیس افسران نے مجھے گھیر کر گاڑی میں ڈالا۔ باڑ درجنوں صحافی اور کمیرہ میز تھے مگر کسی کو میری تصویر اتارنے کا موقع نہ دیا گیا۔ کارکی پچھلی نشست پر میرے دائیں اور بائیں دو افسر بیٹھ گئے۔ ایک پل پر لے جا کر کہا بچ بتاؤ ورنہ ہم تم کو پل سے نیچے چھینک دیں گے اور ہمیں گے کہ تم فرار ہونے کی کوشش میں مارے گے۔ میں خاموش رہا۔ انہیں غصہ آیا اور دونوں دائیں بائیں سے میری گردن اور پیلیوں پر مکے برسانے لگے۔ ایک نے بال کھینچ دوسرے نے پیٹ میں مکے مارے۔ میں نے خاموش رہنے کی ٹھان لی تھی اور ہولی ہیڈ سے برمنگھم کے تین گھنٹوں کے سفر کے دوران خاموشی میرا واحد تھیا رتھا۔

برمنگھم میں ساتھیوں کو بچانے کے لیے پولیس کا وقت کیسے ضائع کیا؟

برمنگھم میں سب سے پہلے انسپکٹر جان ران براؤن میرے پاس آیا۔ اس نے کہا اب اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔ مہاترے کے انگواء اور قتل بارے جو جانتے ہو بتاؤ۔ میں نے سوچا میرے لیے بہتر ہے کہ میں انہیں کچھ نہ بتاؤ اور دیکھوں کہ ان کے پاس میرے خلاف کیا ثبوت ہیں جن کی روشنی میں مناسب جواب کا فیصلہ کرنا تھا لیکن پولیس کی کوشش تھی کہ وہ مجھے کچھ نہ بتائیں اور مجھ سے اگلوں نہیں۔ میری خاموشی پر پولیس میرے بازو مرور ہوتے ہوئے مجھے ایک غسل خانے میں لے

گئی۔ وہاں تھٹھے کے پانی کا ٹپ بھر اور مجھے اس میں غوطے لگانے شروع کر دیے۔ میں پھر بھی خاموش رہا۔ پھر انہوں نے میرے لمبے بال کھینچے اور دشام طرازی کرتے رہے۔ جب کچھ نہ بن پڑا تو مجھے واپس سیل نمبر پیس میں لے جا کر بند کر دیا۔ وہاں کوئی میٹر س اور کمل نہ تھا۔ سردی اب بہت تنگ کر رہی تھی۔ آدھے گھنٹے بعد ران براون واپس آیا۔ اس نے کباب اور روست مرغ میرے سامنے رکھتے ہوئے تشدید کی معاذرت کی اور کہا اب وہ میری دیکھ بھال کرے گا۔ مجھے معلوم تھا کہ جو کام وہ زبردستی نہ کرو اسکے اب وہ نفیساتی حربوں سے کروانا چاہتے ہیں لیکن نفیسات تو میں نے پہلے ہی پڑھ رکھی تھی۔ میں نے سوچا اس طرح دوستوں کو بچانے کی خاطر پولیس کا وقت ضائع کرنے کی میری پالیسی کام کر رہی ہے۔ چلو فی الحال جو مرغ اور روست آیا ہے اس سے جسم کو تھوڑا اسہارا دیتے ہیں۔ کھانے کے بعد قوفی کا دور شروع ہوا۔ اتنے میں ایس پی سپیک پھیکی سی مسکرا ہٹ کے ساتھ وارد ہوا۔ وہ یوں گویا ہوا۔ دیکھو تم نوجوان ادمی ہو۔ تمہاری ساری زندگی آگے پڑی ہے۔ تمہیں امان اللہ خان اور آئی ایس آئی نے پھنسایا ہے۔ تمہیں اب اپنے بارے سوچنا چاہیے۔ یہ ایک سیاسی کیس ہے۔ لندن سے ایک سیاسی شخصیت تمہارے ساتھ منسلکہ شمیر پربات کرنا چاہتی ہے۔ ہم تمہیں سیاسی طور پر پرموٹ کریں گے اور اس میں مالی معاونت بھی شامل ہے۔ ہم برطانیہ میں مسلمان کمیونٹی اور کشمیری کمیونٹی کی بڑی قدر کرتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ تم اس میں ثابت کردار ادا کرو۔ سپیک بہت دباؤ میں لگتا تھا جس کی وجہ سے اس نے شراب پی رکھی تھی اور سکرٹ نوٹی میں بھی دور ان گھنگوکوئی وقفنہ تھا۔ میں نے اسے پوچھا جو پیش وہ کر رہا ہے اس کے لیے مجھے کیا کرنا ہے۔ اس نے کہا ہماری حکومت کا اعتماد بحال کرنے کے لیے سب سے پہلے مہارتے کے اغوا اور قتل کی تقیش میں تعاون کرنا ہے۔ ہمیں پورا سچ بتانا ہوگا۔ اس کے بد لئے تم پر کوئی بڑا الزام عائد نہیں کیا جائے گا۔ سماعت تک تمہیں جیل میں رہنا پڑے گا۔ اس کے بعد تمہیں بری کر دیا جائے گا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ وعدہ معاف گواہ کا جملہ استعمال کیے بغیر مجھے وعدہ معاف گواہ بنانا چاہتے ہیں جو مجھے کسی بھی طرح قبول نہیں تھا۔ میری کمل خاموشی پر وہ سمجھ گیا کہ میں پیش کش قبول نہیں کرنا چاہتا۔ وہ ماہیوی کے عالم میں کھڑا ہوا اور یہ کہہ کر سیل سے نکل گیا کہ میں نے ایک اہم موقع گنوا دیا ہے۔ اس کے باڑ نکلتے ہی سیل میں کسی طرف سے

ٹھنڈری ہوا آنا شروع ہو گئی۔ اس پر بھی جب میں نے کوئی شکایت نہ کی تو ہوابند کردی گئی لیکن ایک ایسی ڈانگری پہنچ کو دی گئی جس سے بدن کو سخت خارش ہوتی تھی۔ صحیح مجھے عدالت میں پیش کر کے مزید ریمانڈ لیا گیا۔ عدالت میں مجسٹریٹ نے میرا نام پوچھنے کے بعد اتنا پوچھا کہ میرے ساتھ اور کون تھا۔ میں نے کہا نو کمنٹ۔ اس پر مجسٹریٹ نے پولیس کو کہا کہ اسے لے جائیں۔

صدیق بھٹی، جہانگیر اور مجید انصاری کی گرفتاری:

عدالت میں پہلی پیشی کے بعد پولیس نے مجھ پر مزید وقت ضائع کرنے کے بجائے اس کیس میں ملوث دوسرے لوگوں کی گرفتاری پر توجہ دینا شروع کر دی۔ شام کو اندر ہیرے میں وہ مجھے اس مکان میں لے گئے جس میں مہاترے کو رکھا گیا تھا۔ میں اس مکان میں مہاترے کے ساتھ ہمراہ ریاض ملک اغوا کاروں کے انتظار میں تین دن رہا تو تھا لیکن چونکہ میں بر منگھم بھی رہائش پر نہیں رہا تھا اس لیے مجھے لوکیشن کا علم نہ تھا۔ جب پولیس مجھے اس مکان میں لے گئی تو مجھے یقین ہو گیا کہ مہاترے کیس میں ملوث کوئی مقامی ادمی پڑا گیا ہے جس نے اس مکان کی نشان دہی کی ہے۔ مجھے یہ پتہ چلا کہ اسلام مرزا کے کزن جہانگیر اور ان کی فیملی کے ایک اور نوجوان مجید انصاری گرفتار ہوئے ہیں تو مجھے حیرت ہوئی کہ وہ تو با اکل بے گناہ تھے۔ پولیس نے جب مجھے ان کے بارے پوچھا تو میں نے کہا میں ان کے بارے کچھ نہیں جانتا اور یہی سچ تھا لیکن بعد میں سامنے آنے والے حقائق سے پتہ چلا کہ ان غواکنرگان میں سے ایک صدیق بھٹی جس کے خالی مکان میں مہاترے کو رکھا گیا تھا اس نے جہانگیر اور مجید کو ساتھ رکھ کر مکان صاف کیا تھا۔ جہانگیر اور مجید جب مان گئے کہ وہ مکان صاف کرنے کے لیے وہاں گئے تھے تو میرے خیال کے مطابق ان کے معصوم ذہنوں میں یہی تھا کہ انہوں نے تو صرف رشتہ دار کی حیثیت سے مکان کی صفائی میں صدیق کی مدد کی ہے جو کوئی جرم نہیں تھا لیکن پولیس نے اسے وہاں مہاترے کے ساتھ میری اور ریاض کی موجودگی کے شواہد ضائع کرنے کی کہانی بنایا کہ ان دونوں کو مجرم بنا دیا۔ جب یہ گرفتار ہوئے تو ان کی جان بخشی کی کوشش کے بجائے اپنے ہی لوگوں نے ان کو مشورے دیئے کہ جرم مان لو اور اپنی جان بچاؤ مگر جان پھر بھی نہ پچی۔ دونوں کو پانچ پانچ سال سزا ہو گئی۔ گومجید اور جہانگیر کے اقبال جرم کی وجہ سے میرے لیے بہت مشکلات پیدا

ہوئیں اور پولیس نے جب یہ اندازہ لگایا کہ میں سچ نہیں اگلتا تو انہوں نے مجھے جھوٹا ثابت کرنے کے لیے دوسرے لوگوں سے ایسے بیانات حاصل کرنے شروع کر دیے جن سے میرا بیان رو ہو جاتا۔ پولیس کی یہ حکمت عملی کامیاب رہی لیکن سب سے زیادہ نقصان مجھے اس وقت ہوا جب صدیق بھٹی نے امان اللہ خان کے کہنے پر اقبال جرم کر لیا۔ اس اقبال جرم سے پہلے مجھے صدیق اور ریاض کے ساتھ جیل کے اندر ایک گھنٹہ چھل قدمی سے بھی محروم کر دیا گیا۔ ان تمام حقائق کے باوجود ان تینوں ساتھیوں کے لیے میرے دل میں کوئی میل پیدا نہ ہوا تھا بلکہ سزا کے بعد گاڑڑی جیل میں جب ہم کوئی سات سال بعد اکھٹے کر دیے گئے تو ہمارا ایک دوسرے کے ساتھ انہتائی برادرانہ روپیہ رہا۔ میرے دل و دماغ میں یہی تھا کہ ہم سب مشکل حالات میں تھے۔ اس وقت کی قیادت نے اچھا کردار ادا نہیں کیا۔ صدیق بھٹی نے معذرت بھی کی کہ اسے شبہ تھا کہ میں نے پولیس کو دیے جانے والے بیان میں شاید زکر کیا جس کی وجہ سے پولیس نے اسے گرفتار کیا لیکن جب میرا پولیس بیان سامنے آیا تو واضح ہوا گیا کہ میں تو ہر ایک کو بچانے کی کوشش کرتا رہا لیکن دوسروں کے اقبال جرم سے میرا بیان رو ہوتا گیا۔ صدیق بھٹی مجھ سے ۹ سال پہلے بری ہو گئے تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ ان پر صرف ایک الزام تھا یعنی انوغاء کا اور مجھ پر سازش، غیر قانونی قید اور قتل کے سنگین الزامات تھے۔ صدیق کی رہائی کے بعد بھی ہمارے تعلقات اچھے رہے لیکن اسلام مرزا جیسے لوگوں کی محفل میں جب وہ واپس گیا تو مجھے محبوس ہوا کہ اس کے ذہن میں زہر بھردیا گیا اور اسے مشورہ دیا گیا کہ جب کوئی پوچھئے کہ تم نے امان اللہ خان کے کہنے پر اقبال جرم کیوں کیا تو کہو کہ اس سے اس نے سزا کم کروائی ہے جسکا مجھے پورا لیکن اس وقت ہو گیا جب صدیق نے ہماری رہائی کے کئی سال بعد مقبول بٹ شہید چوک ڈیال میں متعدد افراد کی موجودگی میں مجھے کہا کہ میں اور ریاض نے برطانوی حکومت کو چینچ کر کے اپنی سزا میں خود اضافہ کروا یا جکہ اس نے اقبال جرم کر کے سزا کم کروائی۔ میں سوچنے لگا کہ کیا یہ وہی صدیق بھٹی ہے جو میرے ساتھ جیل تھا؟۔ اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ صدیق بھٹی فطری طور پر اپنے ہم نوالوں اور ہم پیالوں سے بہتر ادمی ہے۔

اخلاقی و اعصابی قوت

ہمارے پیارے نبی کریم ﷺ نے اخلاق پر بہت زیادہ وزور دیتے ہوئے اسے انسانی کامیابی اور انسانی رشتہوں کی بنیاد قرار دیا ہے۔ ان کی زندگی اخلاق کا عملی نمونہ تھی۔ برطانوی جیل میں قیدی کے اخلاق پر بہت زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ کچھ قیدیوں کو اخلاق سکھایا جاتا ہے، کچھ کا اخلاق بگاڑا جاتا ہے اور بعض کا اخلاقی امتحان لیا جاتا ہے۔ جو قیدی انتظامیہ کے مطابق تعلیم یافتہ اور باشمور ہونے کے باوجود نظام وقت کو چلنچ کریں ان کے اخلاق کو ازما یا جاتا ہے کہ آئا ان کے اعصاب خیالات و نظریات کتنے مضبوط ہیں تاکہ ان کی اعصابی و نظریاتی قوت کے مطابق ان کے ساتھ برداشت و معاملات کیے جائیں۔ برطانوی جیل میں سب سے پہلے سیاسی قیدی کے دماغ پر بقصہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو سکتے تو پھر اسکا دماغ خراب کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جبکہ عام قیدی کو سزا دے کر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ قیدی کے بارے میں جواب دار اسی سوالات اٹھائے جاتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ آیا وہ پیشہ و مجرم ہے یا حادثاتی یا سیاسی نظریات کی وجہ سے کسی جرم کا مرتكب ہوا ہے۔ ان حقائق کا تعمین کرنے کے بعد ماڑنفیات کو نسلانگ بھی کرتے ہیں اور جیل کے اندر سیاسی قیدیوں کی زندگیوں کو مشکل بن کر آزادی کی قیمت کا احساس بھی دلاتے ہیں۔ حکام معلوم کر چکے تھے کہ ہم میں سے کوئی بھی پیشہ و مجرم نہ تھا۔ ہمیں اس حقیقت کا احساس تھا کہ ہم قوی تحریک جیسے مقدس مشن کی خاطر قیدی کاٹ رہے ہیں لہذا جب کوئی داروغہ ہم سے بد تیزی کرتا تو ہم اخلاقی دائرہ میں رکر جواب دینے کی کوشش کرتے۔ جیل انتظامیہ جسمانی روشنی کے خلاف کارروائی کے لیے ہر وقت تیار رہتی تھی۔ اسکے پاس میں پاور ہوتی ہے سیکورٹی مکمل طور پر مسلح اور اور قیدی غیر مسلح

اور بے بس ہوتے ہیں اس لیے مضبوط اعصاب اور با اخلاق قید یوں کواشتعال دے کر جسمانی رو عمل پر مجبور کرنا بعض داروغوں کافن ہوتا ہے لیکن جو قیدی کسی بھی اشتغال انگیزی کے رو عمل میں صبر و تحمل کا مظاہرہ کر کے قانونی کارروائی کریں یا باہر اپنے حامیوں سے کروائیں تو داروغے بے بس ہو جاتے ہیں بلکہ ان کو الثالینے کے دینے پڑ جاتے ہیں کیونکہ باڑ سے قید یوں کے دوست و رشته دار جب اپنے وکلاء یا سیاسی نمائندگان کے ذریعے حکومت پر دباؤ ڈلاتے ہیں تو حکومت جیل انتظامیہ کی سرزنش کرتی ہے۔ اس لینے نہیں کہ حکومت کو قید یوں سے بہت ہمدردی ہوتی ہے بلکہ اس لیے کہ حکومت کے لیے کئی معاملات شرمندگی اور اضافی کام کا موجب بن جاتے ہیں۔ ہماری طرح کچھ ایسے قیدی بھی تھے جن کے بارے میں حکومت کی اپنی سخت پالیسی تھی اور چاہتی تھی کہ ان کو سبق سکھایا جائے کہ حقوق کی جنگ کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ برطانیہ چونکہ ایک سامراجی ملک رہا اور اب بھی ہے اس نے طاقت کے بل بوتے پر غاصبانہ قبضے قائم رکھے اس لیے آزادی پسندوں سے نفرت اس کی فطرت ثانیہ بن چکی ہے مگر برطانیہ کے عوام کی ایک بڑی تعداد اب بہت بدلت چکی ہے۔ اسے انسانی حقوق کا بڑا احساس ہے اور اسی احساس کی بنا پر ہماری خفیہ اور اضافی سزاوں کے خلاف مہم میں میں سٹریم برطانوی میڈیا اور درجنوں اراکین پارلیمنٹ اور عدالیہ نے بھی اہم کردار ادا کیا جس کی تفصیل اگلے صفات میں آئے گی۔

جیل ٹاف ہمیں لنج کرو کر ایک بجے بریک کر کے خود کھانا کھانے کے لیے جایا کرتے تھے۔ ایک دن سردار جی اس وقت پھر آگے جب باقی سارا ٹاف کھانے کے لیے کہنیں پر گیا ہوا تھا۔ ٹاف کی لنج سے واپسی تک سردار صاحب کی ڈیوٹی ہماری لینڈنگ پر تھی۔ اس دوران تمام قیدی بند ہوا کرتے تھے اور کسی ٹاف کی آمد کی توقع نہ ہوتی تھی۔ میرے سیل کے دروازے کے درمیان ایک چھوٹا سا سوراخ تھا جس پر صرف ایک آنکھ رکھ کر سیل کے اندر قیدی کو دیکھا جاسکتا تھا اسکا ڈیزائن اس طرح کا تھا کہ باہر سے سیکورٹی کو سیل کا پورا احاطہ نظر آتا تھا لیکن قیدی کو اندر سے سیکورٹی افسر کی صرف آنکھ نظر آتی تھی۔ سوراخ سے ڈکلن اٹھانے کی مجھے آواز آئی۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ یہ کون ہو سکتا ہے تو باڑ سے آواز آئی: کدال؟ میں نے فوری پوچھا۔ کون؟ سردار جی بولے: آپ، ہی ہاں راجہ صاحب۔ دوستانہ انداز میں دوستانہ آواز سنکر میرے کا نوں میں بننے والی خطرے کی گھنٹی ایک دم بند ہو گئی۔ خطرہ یہ تھا کہ جب تمام قیدی بند ہوتے تھے تو ہم جیسے ہائی رسک قید یوں کو

خفیہ طور پر یا تو کسی دوسری جیل میں یا پھر کوئی ازام لگا کر سیگر یلیشن یونٹ میں منتقل کیا جاتا تھا جہاں پہلے سے ہی محدود ہے یعنی کم کر دی جاتی تھیں۔ قیدی کو فرش پر اندر ہیرے میں سونا پڑتا تھا۔ اور بھی کئی تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ یہ ایک مجرہ تھا کہ مجھے ابھی تک اس سیگر یلیشن یونٹ کا تجربہ نہ ہوا تھا بس کہانیاں ہی سن رکھی تھیں۔ جو بھی قیدی وہاں جاتا تھا وہ تو اپس آتا تھا۔ بات سردار صاحب کی ہو رہی تھی۔ انہوں نے پوچھا۔ اور اجے صاحب! کوئی تکلیف تکلوف نہیں۔ میں نے کہا سردار جی۔ چوپیں گھنٹوں میں صرف ایک گھنٹہ چہل قدمی کے لیے ملتا ہے اور وہ بھی اپنے دوسرا دوسرا چھوٹوں کے بغیر۔ وہ دونوں اکھٹے چہل قدمی کے لیے بھیجے جاتے ہیں اور میں اکیلا۔ اور اجے جی۔۔۔ تو انوں سرکار نے رنگ لیڈر بنادتا وے۔ وڈیاں دے وڈے ہی مسلے ہوندے نے۔ بس صبر کرسو۔ رب رحم کرے گا۔ میرے لئے اگر کوئی خدمت ہے تو دو۔ میں نے کہا سردار جی باتی قیدیوں کو اخبارات مل جاتے ہیں۔ میرے ساتھی ریاض کا گارڈین اخبار بھی آ جاتا ہے۔ میراجنگ اخبار بائز سے لگایا گیا ہے لیکن مجھے ڈیلپور نہیں کیا جاتا۔ سردار صاحب نے کہا کہ جنگ چونکہ اردو میں ہے اس لیے سیکورٹی سوچتی ہے کہ اردو میں آپکے کسی دوست کی طرف سے کوئی خفیہ پیغام نہ ہو۔ سردار جی نے کہا آپکے خطوں کا ترجمہ میں ہی کرتا ہوں میں گورنر سے بات کروں گا۔ اس کے بعد جنگ اخبار مجھے ملنا شروع ہو گیا۔ ایک دن مجھے حاجی آفتاب احمد انصاری صاحب آف میر پور حوال برٹش ہم نے سیرت نبوی کی ایک کاپی بھیجی جس میں رسول کریم پر طائف میں او باش لڑکوں سے کروائے جانے والے تشدد اور دیگر تکالیف کا ذکر تھا جسے پڑھکر مجھے کافی حوصلہ ملا۔ ہر روز میرے سیل کی تلاشی میں جاتی تھی۔ میں نے اس کتاب کا وہ صفحہ المٹ دیا جہاں تک میں نے اسے پڑھا تھا۔ سیکورٹی سیرت نبوی کی وہ کتاب اٹھا کر یہ کہہ کر لے گئی کہ وہ گورنر کو دکھائیں گے کہ یہ کتاب مجھ تک کیسے پہنچی اور آیا اسکا ترجمہ کروانا ضروری ہے یا نہیں۔ درمیانی عمر اور درمیانی نے قد کا گورنر گلڈ وین بڑا سمجھدار ادمی تھا۔ وہ اکثر میری کم گوئی پر مجھے چھپیرا کرتا تھا۔ گورنر پر لازم تھا کہ وہ ہائی رسک قیدیوں کو ہر روز صبح خود سیکورٹی کو ساتھ رکھ کر چیک کرے۔ دوسرے دن گورنر گلڈ وین سیرت نبوی کی کاپی ہاتھ میں لیے آئے۔ مجھے پوچھا کہ اس کتاب کا مطالعہ میرے لیے کیوں ضروری ہے؟ میں نے کہا اس میں تشدد کے خلاف امن کا پیغام ہے۔ گورنر نے ایک دم نظر میری اٹھا کر میری طرف دیکھا اور کہا یہ تو بہت اچھی کتاب ہے: انہوں نے اٹ!

سیرت نبوی کی کتاب پر گورنگلدوین کی مختصر گفتگو سے اندازہ ہوا کہ گورنر نے جیل کے مترجم کی مدد سے اس کتاب کے مندرجات کا جاہ لے لیا تھا جسے اس نے کافی ثابت پایا جس کی وجہ سے گورنر نے کتاب مجھے مطالعہ کے لیے واپس کر دی۔ میں پہلے زکر کر چکا ہوں کہ جیل کا مترجم ایک سکھ تھا جو بڑا دیانتدار اور ادی تھا۔ اگر ہمارے آنے والے خطوط یا کسی اور عمل سے کوئی بات ہمارے خلاف جا رہی ہو تو وہ ہمیں اس سے مقاطر ہے کا مشورہ بھی دے دیا کرتا تھا۔ گورنر نے سیرت نبوی کے علاوہ میرے سیل میں پڑی دوسری کتابوں پر نظر ڈالی پھر پوچھا آپ کو نسا اخبار پڑھتے ہیں میں نے کہا انگلش اخبار گارڈین اور اردو روزنامہ جنگ لیکن جنگ جیل پنج کرکیں غائب ہو جاتا ہے میری اس شکایت پر گورنر اور سکھ مترجم دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے گارڈین اخبار تو تھا ہی بڑیں جو ایک احتقر جیل کی لاہبریری کو دیا کرتا تھا لیکن جنگ اخبار ہمیں باائز سے کچھ دوست پوسٹ کیا کرتے تھے۔ گورنر نے کہا کہ میں جنگ اخبار بھی براہ راست جنگ کے ڈسٹری بیوٹر سے مغلوا یا کروں۔ بعد میں مجھے اپنے زرائی سے معلوم ہوا کہ جیل انتظامیہ کو خدشہ تھا کہ اخبار کے اندر ہمارے دوست کوڈور ڈکے ریلے ہم تک کوئی پیغام نہ پہنچا دیں ہم نے جیل لاہبریری کے ذریعے جنگ کا آرڈر بک کروا یا اور بعد میں چناری مظفر آباد سے تعلق رکھنے والے علی کیانی ایڈیٹر روزنامہ وطن بھی لفافے پر شروع میں ہی کہہ دیا گیا تھا کہ مجھے جو کتاب چاہیے اسکا عنوان اور مصنف کا نام لکھ کر میں سیکورٹی کو دوں تو وہ مجھے گورنر سے منتظر کروا کر کتاب لادیں گے لیکن ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ میں سائنس۔ قانون اور نفیسات کے موضوعات پر کوئی کتاب آرڈرنیس کر سکوں گا۔ پوچھنے پر اتنا کہا گیا کہ یہ حکام بالا کا حکم ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ معلوم ہوا کہ حکام بالا نہیں چاہتے تھے کہ میری قانونی معلومات میں اضافہ اور جیل میں ازمائے جانے والے نفیساتی حربوں کا مجھے علم ہو۔

میں نے گورنگلدوین کی توجہ میں یہ مسئلہ لاتے ہوئے کہا کہ میڈیکل سائنس تو میرا سبجیکٹ نہیں لیکن قانون اور نفیسات میں میری دلچسپی ہے لہذا مجھے دوسرے قیدیوں کی طرح لاہبریری وزٹ کی اجازت دی جائے سارے اختیارات چونکہ جیل گورنر کے پاس بھی نہیں ہوتے تھے کیونکہ ہم ہائی رسک سیاسی قیدی تھے جنکے اکثر فیصلے کیجیئری اے کمیٹی کیا کرتی تھی جس کا سربراہ ڈی جی جیل خانہ جات تھا جو بعض اوقات وزیر داخلہ سے بھی مشاورت کیا کرتا تھا اس لیے جیل گورنر نے مجھے جیل کی

مرکزی لائبریری میں جانے کی اجازت تو نہ دی لیکن ونگ لائبریری میں اجازت دے دی جہاں
 محدود کتابیں تھیں۔ قانون اور نصیلت کے موضوع پر تو مجھے وہاں سے کوئی کتاب نہ ملی مگر سیاست پر
 کچھ کتابیں تھیں۔ میں نے مہاتما گاندی اور سوویت یونین کے ایک بڑے لیڈر جوزف شالن کی
 بائیوگرافی لائی۔ جو بھی قیدی کتاب حاصل کرتا اس کے نام پر ایک ہفتہ کے لیے کتاب بک کی جاتی تھی
 اس طرح جیل گورنر چاہتا تو معلوم کر سکتا تھا کہ کون قیدی کوئی کتب کا مطالعہ کرتا ہے آہستہ آہستہ جیل
 گوزنے یہ اندازہ کر لیا کہ انہیں ہمارے بارے جو شکوہ و شبہات تھے وہ غلط تھے وہ سوچتے تھے کہ
 شاید تحریک کاری اور دہشت گردی کے موضوعات میں ہمیں زیادہ دلچسپی ہوگی اکثر انگریز رکھیں مزاج
 ہوتے ہیں اس لیے وہ جنسی موضوعات پر لکھی گئی کتابوں کا کافی مطالعہ کرتے تھے مگر ہم سارے
 کشمیری قیدی نوجوان مسلمان تھے جو مخالف جنس کو فی الحال بھول جانے میں ہی عافیت محسوس کرتے
 تھے۔ ہمیں معلوم تھا کہ ہمارا سفر بڑا المباہ ہے اور مخالف جنس کی یادیں جیل کی تلخیوں میں اضافے کا
 باعث تھیں گورنر صاحب ایک دن میرے سیل میں آئے اور میری کتابوں پر نظر ڈالتے ہوئے کہا
 آپ کے موضوعات بہت سمجھیدے ہیں میں گورنر کا مطلب سمجھ گیا کہ میں دوسرے قیدیوں کی طرح جنسی
 میگیز یہ بھی نہیں پڑتا جو حیرت انگیز طور پر جیل لائبریری مفت قیدیوں کو ڈالیور کر دیا کرتی تھی کیونکہ وہ
 بعض گٹر ٹاپ کے اخبارات کے ساتھ تھیج دیے جاتے تھے اور کچھ قیدی تو ان کا آڑڈر بھی کیا کرتے
 تھے میں نے گورنر کو جواب دیا کہ جناب زندگی ایک سمجھیدہ مسئلہ ہے گورنر نے کہا مگر زندگی ایک ہی بار
 ملتی ہے اس نے پوچھا بائی داوے یہ ڈاکٹر فاروق عبداللہ کون ہے؟ مہاترے کیس کے نتیجے میں
 ہماری گرفتاری کے وقت فاروق عبداللہ کافی زیر بحث آئے تھے کیونکہ وہ اس وقت چیف منستر تھے
 گورنر کو معلوم تو تھا ہی لیکن شاید وہ میرے خیالات کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ میں نے بر جستہ کہا جناب وہ تو
 آپکے بہنوئی ہیں۔ گورنر نے چوکتے ہوئے پوچھا میرا بہنوئی؟ میں نے سپنس توڑتے ہوئے کہا جی
 ہاں آپکے قومی بہنوئی۔ انگریز چونکہ رومانوی گفتگو پسند کرتے ہیں اس لیے میں نے کہا فاروق عبداللہ
 برطانیہ میں میڈیکل سائنس کا طالب علم تھے اور کچھ عرصہ یہاں بطور ڈاکٹر کام بھی کیا اس دوران وہ
 ایک انگریز خاتون کو دل دے بیٹھے (عشق نہ پچھے ذاتاں) اور شادی کر کے کشمیر لے گے۔ گورنر نے
 مسکراتے ہوئے کہا بہت دلچسپ۔ بہت دلچسپ۔ اس طرح گورنر گلد وین اور میں آہستہ آہستہ کافی
 فریبک ہو گے۔

پچھے جیل کا ڈاکٹر بھی کبھار ہماری صحت کا جائزہ لینے کے لیے ہمارے سیل میں آیا کرتا تھا ایک دن جب بھارت نژاد ڈاکٹر آیا تو میں مہانتا گاندی کی وہ کتاب پڑھ رہا تھا جس پر گاندی فلم بھی ریلیز ہو چکی تھی بھارتی ڈاکٹر نے میرے ہاتھ میں گاندی کی کتاب دیکھ کر خوشنگوار حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا اور آپ گاندی جی کو پڑھنا پسند کرتے ہیں میں نے کہا جی ہاں کیوں نہیں؟ تو آپ ہندوستان سے الگ بھی ہونا چاہتے ہیں اور گاندی جی کو پسند بھی کرتے ہیں۔ میں نے کہا آزادی ہم اس لیے نہیں مانگتے کہ ہمیں آپ سے نفرت ہے بلکہ یہ ہمارا فطری حق ہے اسی طرح جس طرح برطانیہ سے آزادی حاصل کرنا آپ کا حق تھا مگر بد قسمتی سے آپ نے آزادی حاصل کرتے ہی ہماری ریاست کو جبری طور پر تقسیم کر دیا۔ کسی ریاست کی تقسیم کا مطلب خاندانوں کی تقسیم ہوتا ہے اور خاندانوں کو تقسیم کرنا بہت بڑا جرم ہے! ڈاکٹر نے کہا کہ کیا جموں کشمیر کی تقسیم کا ذمہ دار صرف بھارت ہے؟ اسکا اشارہ پاکستان کی طرف تھا۔ میں نے کہا ماضی میں جو ہوا سو ہوا لیکن اب آپ دونوں اپنی فوجیں زکالیں گے تو تب ہی ریاست جموں کشمیر کی وحدت بحال ہو سکتی ہے۔ بھارتی ڈاکٹر نے میری تجویز کا جواب دیے بغیر میرے ہاتھ سے گاندی جی کی کتاب لی اور اس صفحہ پر نظر ڈالی جو میں پڑھ رہا تھا۔ سیل کے اندر بیٹھنے کے لیے جگہ نہ تھی تو یہ ساری گفتگو کھڑے کھڑے ہوئی۔ ڈاکٹر نے پوچھا کیا مجھے کسی دوائی کی ضرورت ہے میں نے نفی میں جوب دیا تو وہ مجھے گذلک و دریڈنگ گاندی کہہ کر واپس چلا گیا۔ اس ہندو ڈاکٹر کا مجھے نام یاد نہیں رہا۔ وہ مستقل ڈاکٹر عبد الرحمن کی غیر حاضری میں اس کی جگہ آیا تھا۔ ڈاکٹر عبد الرحمن بھی بھارتی تھا۔ جموں کشمیر کی سیاسی صورت حال اور ہمارے سیاسی نظریے کے بارے میں مکمل جانکاری کے لیے بھارتی اور برطانوی حکام نے اب ایک مشترکہ کوشش شروع کر دی تھی جسکا اندازہ ہمارے ساتھ ہونے والی برطانوی مائرین کے ساتھ ساتھ بھارتی پس منظر کے مالک افسران کی ملاقاتوں اور انٹرویو سے ہوا۔

میڈیکل ڈاکٹروں سے کیوں سیاسی خدمات لی گئیں؟

گرفتاری کے بعد جب مجھے سیاسی حمایت اور مالی تعاون کے نتیجے میں جموں کشمیر بریشن فرنٹ کے خلاف بیان دینے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی گئی تو یہ بھی کہا گیا کہ بھارت سے آئی ہوئی کچھ شخصیات بھی مجھ سے ملنا چاہتی ہیں۔ یہ اندازہ کرنا میرے لیے مشکل نہ تھا کہ وہ بھارتی شخصیات

کون ہو سکتی ہیں؟ یقیناً وہ خفیہ بھارتی ایجنسی را کے ایجنت تھے جن کی طرف سے یہ اشارے مل چکے تھے کہ پاکستانی خفیہ ایجنسی آئی ایس آئی نے لبریشن فرنٹ کی قیادت پر دباؤ ڈال کر مہاترے کو قتل کروایا ہے۔ میں ایجنسیوں کی اس جگہ کا حصہ نہیں بننا چاہتا تھا جس کی وجہ سے میں نے بھارتی شخصیات کے ساتھ ملاقات سے انکار کر دیا۔ رہائی کے بعد بھی ایک غیر ملکی سفارتکار نے مجھے پوچھا کہ اگر بھارتی نمائندہ آپ سے ملنے آئے تو آپ اسے کیا کہیں گے؟ میں نے کہا میں اسے کہونگا کہ ہم آپ کی آزادی کی قدر کرتے ہیں آپ ہماری آزادی کی قدر کریں۔ اگر اس بار بھی مجھے بھارتی نمائندے سے ملتا ہوتا تو میں یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ پہلے وہ مجھے ملے۔ میں اسے سننے کے بعد جواب دوں گا لیکن میں نے ان کی شرائط پر ملاقات سے گریز کیا۔ بحال جیل کے اندر جب میں نے کسی بھی بھارتی کے ساتھ ملاقات سے انکار کر دیا تو ان کے پاس جیل کے ملازم بھارتی ڈاکٹروں کی خدمات حاصل کرنے کے علاوہ کوئی چارہ کارنے تھا۔ مسئلہ کشمیر چونکہ سفر لیقی ہے اس لیے میرا خیال ہے کہ بھارتی اور پاکستانی نمائندوں کے ساتھ ہم کشمیریوں کی ملاقاتیں تو ضروری ہیں لیکن ایسی ملاقاتیں نقصان دہ ہیں جن میں ہندوستان اور پاکستان ہمیں ایک دوسرے کے خلاف استعمال کرنے کی کوشش کریں۔ ہندوستان اور پاکستان کو بھی اب تک یہ سمجھ آ جانی چاہیے کہ انہیں برصغیر میں امن و خوشحالی لانے کے لیے ٹکراؤ نہیں تعاون کی ضرورت ہے۔ امن و خوشحالی کا خواب مسئلہ کشمیر کے منصافانہ و دیر پاھل کے بغیر پورا نہیں ہو سکتا۔

۰۰۰

کیا پاکستان کے خلاف بھی جنگ کرو گے؟

جس بھارتی ڈاکٹر نے مجھے مہاتما گاندی کی کتاب پڑھتے دیکھا اس نے لازمی کسی بالا افسر کے ساتھ ذکر کیا ہوگا کیونکہ چند دن بعد وہ سیکورٹی افسران آئے اور مجھے کہا کہ ڈاکٹر عبدالرحمن مجھ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ جزوں چیک اپ کی صورت میں تو ڈاکٹر ہر وارڈ میں روٹین کے مطابق کبھی کبھی چکر لگایا کرتا تھا جبکہ اگر کوئی قیدی یا مارہ جاتا تو اسے ڈاکٹر سے ملنے کی درخواست کرنا پڑتی تھی۔ میں نے ایسی کوئی درخواست نہیں کی تھی اس لیے میں نے سیکورٹی افسران سے پوچھا کہ ڈاکٹر نے مجھے کیوں بلا یا ہے۔ سیکورٹی افسران نے کہا انہیں کوئی علم نہیں۔ انہیں صرف حکم ملا ہے کہ وہ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے جائیں۔ سیکورٹی جب مجھے ڈاکٹر کے دفتر میں لے گئی تو یہ ڈاکٹر کا معائنہ روم نہیں تھا بلکہ ایک بڑا دفتر تھا جس کی میز پر بہت سارے آلے پٹے ہوئے تھے۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے میرے ساتھ ڈاکٹر کی گفتگو ان آلوں کے ذریعے کسی خفیہ مقام پر بیٹھے عناصر دیکھے اور سن رہے ہیں۔ میں نے ایک لمحہ وہاں موجود تماں اشیاء کا جائزہ لیا اور ان اشیاء میں سے کوئی بھی چیز میری پیش کے معائنے سے متعلق نظر نہیں آتی تھی۔ میرے ذہن میں کئی طرح کے سوالات گردش کر رہے تھے کہ ڈاکٹر عبدالرحمن نے اپنے سامنے سکرین سے نظر ہٹا کر میری طرف پہنچنے ہوئے میرا حال احوال دریافت کیا۔ ڈاکٹر نے آہستہ آہستہ گفتگو کا رخ بر صیری کی سیاست کی طرف موڑتے ہوئے مجھے پوچھا: آپکا سب سے بڑا دشمن کون ہے؟ میں نے کہا ڈاکٹر صاحب یہ سیاسی سوالات تو آپ کی پیشہ وارانہ ذمہ دار یوں سے متعلق نہیں رکھتے۔ ڈاکٹر حمن مسکریا اور کہا آپ تو سیاسی ہیں نا۔ وقتاً فوقتاً کسی نہ کسی کو تو

آپکے ساتھ آپ کی قید سے متعلق گفتگو کرنی ہی پڑے گی۔ میں آپکا ڈاکٹر اور مسلمان ہونے کی وجہ سے ہمدرد ہوں آپ مجھ سے کھل کر گفتگو کر سکتے ہیں۔ اپنوں کے کافی تجربات مجھے ہو چکے تھے اس لیے میں اب کافی محتاط ہو چکا تھا۔ ان حالات میں شک اور احتیاط کے درمیان لکیر بہت باریک ہو جاتی ہے۔ میں نے پوچھا ڈاکٹر صاحب آپ کا تعلق کہاں سے ہے اور کس نے آپ کو مجھ سے اس گفتگو کا کہا؟ ڈاکٹر نے گہری سانس لیتے ہوئے انتہائی نرم لمحے میں کہا بس ہم سب مہاجر ہیں لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ بھارتی مسلمان تھا۔ ڈاکٹر کے اس سوال پر کہ ہم کس کو اپناسب سے بڑا شمن تصور کرتے ہیں میں کہنا چاہتا تھا کہ ہمارا شمن وہی ہے جو ہماری آزادی کا دشمن ہے لیکن میں نے یہ سوچ کر ایسا نہ کہا کہ دیکھتے ہیں ڈاکٹر مزید کیا سوال کرتا ہے۔ ڈاکٹر نے جب دیکھا کہ میں اس کے سوالوں کا اس کی مرضی کے مطابق جواب نہ دوں گا تو اس نے جزوی سوالات کو مخصوص کرتے ہوئے پوچھا کیا ڈاکٹر فاروق عبداللہ آپ کی رکاوٹ ہے؟ میں نے کہا ڈاکٹر صاحب جو کوئی وحدت کشمیر کی بحالی کا مخالف ہے وہ ہمارے نزدیک رکاوٹ ہے۔ کسی بھی کشمیری اور انصاف پسند انسان کو جموں کشمیر کی تقسیم کے خاتمے کی مخالفت نہیں کرنی چاہیے۔ ڈاکٹر نے ایک اور مخصوص سوال کیا: کیا پاکستان آپ کی آزادی کی حمایت کرتا ہے۔ میں نے کہا ڈاکٹر صاحب ہم تو ایک صاف اور جائز مطالبہ کر رہے ہیں کہ ہماری ریاست کی جبری تقسیم ختم ہونی چاہیے اب جو کوئی اس میں رکاوٹ بنے گا وہ خود بخوبی ناقاب ہو جائے گا۔ ڈاکٹر نے پوچھا لیکن اگر پاکستان مخالفت کرتا ہے تو آپ کیا کریں گے؟ یہی اصل مقصد تھا جس کی خاطر کسی نے ڈاکٹر کو ذمہ داری سونپی کہ وہ معلوم کرے کہ ہم نے ہندوستان کے خلاف تو اعلان جنگ کیا ہوا ہے لیکن کیا اگر پاکستان رکاوٹ بنے تو ہم پاکستان کے خلاف بھی عسکری جدوجہد کریں گے۔ میرا تجویہ باکل درست تھا کیوں کہ ایک سال بعد دوران ساعت نج سر پیغمبر رسول نے بھی مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا آپ جموں کشمیر کی مکمل آزادی چاہتے ہیں؟ میں نے اثبات میں جواب دیا تو نج نے کھلی عدالت میں کہا: لیکن آپ جنگ تو صرف بھارت کے خلاف کر رہے ہیں۔ دوران ساعت بھارت کی ایک لیگل ٹیم بعدہ سینئر سفارتکار عدالت میں موجود رہتے تھے جبکہ پاکستان کے سفارتکار بھی کبھار عدالت میں آیا کرتے تھے۔ دوران جرج میں نج کے دائیں طرف کھڑا تھا۔ استغاثہ اور کیبل دفاع میرے سامنے اور ان کے پیچھے بھارتی لیگل ٹیم اور سفارتکار جبکہ باعیں طرف چند فٹ اونچائی پر بارہ اراکین پر مشتمل جیوری اور ان کے نیچے پریس کی کرسیاں تھیں۔ میرے سامنے دوسرا منزل پر ایک بہت

بڑی پبلک گیلری تھی جو ہر وقت کچھ بھج بھری رہتی تھی۔ ان میں کچھ تمثیلی ہوتے تھے اور کچھ ہمدرد۔ ڈاکٹر عبدالرحمن اور میری گفتگو میں کوئی خاص چاشنی نہ پیدا ہو سکی کیونکہ ڈاکٹر کو میرے دل و دماغ کو ٹوٹو لئے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ میں نے محتاط رویہ اپنا یا ہوا تھا جس کی وجہ سے ڈاکٹر کو اپنے سوالوں کے مجھ سے مرضی کے جوابات نہ مل رہے تھے۔ ڈاکٹر نے شکوہ کیا کہ میں تعاون نہیں کر رہا لیکن میں نے کہا ڈاکٹر صاحب آپ بھی تو کھل کر نہیں بتا رہے کہ اس انسٹرویو کا مقصد کیا ہے۔ ایک دن ایک اور ڈاکٹر میرے سیل میں آ گیا اس نے کہا وہ پاکستانی ہے۔ اس کی اردو تو بہت اچھی تھی لیکن نقش سے وہ پاکستانی نہیں لگتا تھا۔ جب اس نے کہا کہ وہ پاکستانی ڈاکٹر ہے تو میں نے کہا آپ جو بھی ہیں میرے نزد یک آپ صرف ایک ڈاکٹر ہیں۔ اس نے میری طرف غور سے دیکھا اور واپس جاتے ہوئے کہا کوئی پر ابلم ہوا تو مجھے بلا لینا۔ بھارتی ڈاکٹر نے ایک دکھی محبوبہ کی طرح پیچھے مرکر میری طرف دیکھا تو میں نے کہا کیا میں بھی آپ سے ایک سوال کر سکتا ہوں؟ ڈاکٹر خوشی سے باغبان ہو گیا۔ شاید یہ سوچ کر کہ اب میں کھل کر اس سے بات کروں گا۔ میں نے پوچھا ڈاکٹر صاحب کیا ہندوستان اور پاکستان آزاد ہو گئے ہیں؟ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا وہ تو چھٹا لی (ستالیس) میں ہو گئے تھے۔ میں نے کہا نہیں چھٹا لی میں انگریز نے اپنے دو بچوں ہندوستان اور پاکستان کو حنم دے کر تاحیات لڑائی کا ایجنت اسیٹ کیا تھا جس پر آپ دونوں عمل کر رہے ہیں۔ اگر آپ واقعی آزاد ہیں تو جموں کشمیر کو آزاد کر کے اپنی ترقی پر توجہ دیں۔ ڈاکٹر نے خاموشی سے اثبات میں گردان اوپر نیچے کی اور پھر ملیں گے کہہ کر چلا گیا۔ جیل میں مختلف گریڈز کے گورنر ہوا کرتے تھے لیکن ہمیں اکثر گورنر گذوں ملنے آیا کرتا تھا۔ ایک دن وہ بڑا سخیدہ رویہ اپناۓ میرے سیل میں داخل ہوا۔ کہنے لگا اسے جیل افسران کی طرف سے شکایت ملی ہے کہ میں ان سے بات نہیں کرتا۔ ایسا نہ کرنا امن و امان کی خلاف ورزی ہے۔ میں نے پوچھا خاموش رہنے سے امن و امان میں کیسے خلل پڑتا ہے تو گورنر نے کہا جب تیدی سٹاف کو جواب نہ دے تو قیدی اور سٹاف کے درمیان کمیکلشن مشکل ہو جاتا ہے۔ آپ ایک اچھے چال چلن کے قیدی تصور کیے جاتے ہیں آپ نے سٹاف سے کیوں گفتگو بند کر رکھی ہے۔ میں نے کہا جناب دیکھیں نا آپ کے افسران ہر محضی (ملکہ کا نائٹل) کے یونیفارم میں لکھنے سارٹ لگتے ہیں لیکن جب یہ کلام کرتے ہیں تو انتہائی غیر اخلاقی زبان استعمال کرتے ہیں۔ میں نے غیر اخلاقی زبان کا جواب غیر اخلاقی زبان میں دینے کے بجائے خاموشی اختیار کر لی ہے۔ گورنر کے پیچھے

کھڑے سٹاف ممبر ان نے شرمندگی سے سرجھا لیے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ دوران گفتگو ایک دوسرے کو گالی دینا جیل کلچر کا حصہ تھا۔

ہماری ملاقاتوں کا طریقہ کار

جیل میں جب بھی سرکاری یا غیر سرکاری ملاقات ہوتی تو ہم سے ایک میمو پر دخنٹ کروائے جاتے جس پر لکھا ہوتا کہ ہمیں اس ملاقات پر کوئی اعتراض نہیں مگر ہم نے اس بنیاد پر اعتراضات شروع کر دیئے کہ جن دوستوں اور رشہ داروں کے نام ہم نے ملاقاتیوں کی لسٹ پر درج کیے تھے ان کو وزارت داخلہ کی اجازت درکار تھی مگر کچھ نامعلوم ملاقاتیوں کو جیل انتظامیہ ملاقاتی روم میں لا کر ہم کو بتائے یا مشورہ کیے بنا ہمیں ان سے ملنے کے لیے لے جاتی۔ ہمارا موقف تھا کہ جس طرح ہم ملاقاتوں کے لیے درخواست کرتے ہیں اسی طرح اگر جیل انتظامیہ کسی کے ساتھ ہماری ملاقات کروانا چاہتی ہے تو وہ بھی ہم سے درخواست کرے کہ آیا ہم ملاقات کے لیے رضامند ہیں یا نہیں مگر اکثر اوقات ہمیں ہمارے بلاک کے ایک پیش رو میں لے جایا جاتا جہاں نامعلوم ملاقاتی یا تو پہلے سے ہی موجود ہوتے یا ہمارے پہنچنے کے فوری بعد لائے جاتے۔

تعلیمی و خاندانی پس منظر کی چھان بین:

جیل گورنگ ڈوین سے جب میں نے جیل افسران کی نازیباز بان کے استعمال کی وجہ سے ان سے گفتگو سے گریز کرنے کا ذکر کیا تو گورنر نے میرا پس منظر جانے کا فیصلہ کیا جسکا مجھے تبل علم ہوا جب ایک دن مجھے ڈی بلاک کے ایک پیش رو ملاقاتی روم میں لے جایا گیا جہاں ایک درمیانی عمر، دراز قد اور گندی رنگ کا مالک ایشیائی بڑے احترام سے اٹھ کر مجھے ملا۔ اس نے میرا حال احوال پوچھنے کے بعد ملاقات کا مقصد بتاتے ہوئے کہا کہ گورنر نے اسے میرا انٹرو یو کر کے میرے پس منظر کے بارے ایک رپورٹ پیش کرنے کے لیے کہا ہے۔ میرے پوچھنے پر اس نے کہا کہ وہ ہندوستانی سکھ ہے اور پیشے کے لحاظ سے برٹش میں صدر معلم ہے۔ گورنر نے کسی مسلمان کو یہ سوچکر میرے انٹرو یو کے لیے منتخب نہ کیا کہ شاید وہ میرے حق میں جانبداری برتبے اور کسی ہندو کو اس لیے منتخب نہ کیا کہ بھارتی سفارت کار مہاترے ہندو تھا جبکہ انگریز کو بھی اس لیے مناسب نہ سمجھا کہ انگریز سوچتے تھے کہ ان

کے ملک میں جرم کا ارکاب ہوا اور شاید وہ بھی امتیاز برترے۔ گورنر کو چونکہ سچ کی تلاش تھی اس لیے اس نے میرے لیے ایک سکھ کو موزوں جانا اور واقعی اس سکھ نے انہائی دیانتداری سے رپورٹ تیار کی۔ اس سکھ ہمیڈ ماسٹر نے میری پیدائش سے لے کر گرفتاری تک میری زندگی پر متعدد سوالات کیے جن میں تعلیم۔ یورپی زبانوں سے واقفیت اور مختلف ممالک میں قیام و ڈپلومی کی وجہات شامل تھیں۔ خاندانی پس منظر کے ساتھ ساتھ آخر میں یہ سوال بھی کیا کہ آیا میں پہلے کبھی کسی ملک میں قید ہوا؟ میں نے اس انٹرویو کی وجہ پوچھی تو سردار نے کہا کہ یہ میرے فاہدہ کے لیے ہے۔ اس فاہدہ کا مجھے اس وقت اندازہ ہوا جب سردار صاحب رخصت ہونے کے بعد چند منٹ بعد پھر واپس آگئے اور مجھے ونگ انجمنی چارج جسے جیل میں پی او یعنی پرنسپل افسر کہا جاتا ہے کے دفتر میں لے گئے۔ سردار جی نے پرنسپل افسر کو کہا رپورٹ تو گورنر کو دودون میں پیش کر دی جائے گی لیکن آپ مسٹر راجہ کا نیماں رکھنا یہ پیشہ و رحم نہیں ہیں۔ پرنسپل افسر کا رو یہ فوری ثابت ہو گیا۔ دودون بعد گورنر گڈوین مسکرا تھا ہوا میرے سیل میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ سیکورٹی چیف اور دو اور افسران تھے۔ گورنر نے کہا ہمیں اب معلوم ہوا آپ کون ہیں؟ دیکھیں جیل افسران آپ کیوں نہیں دیتے بلکہ یہ جیل کا کلچر ہے البتہ آج کے بعد جیل افسران آپ کے ساتھ گفتگو کرتے وقت کوئی غلط الفاظ استعمال نہیں کریں گے۔ واقعی ایسا ہی ہوا۔ یوں تو گورنر صحیح ہمارے ونگ کا چکر لگایا کرتا تھا لیکن دو ہفتے بعد سیکورٹی چیف پھر گورنر کے ساتھ تھا۔ گورنر نے مذاہیہ انداز میں پوچھا اب تو کوئی گالی نہیں دیتا؟ میں نے کہا نہیں تو سیکورٹی چیف نے گورنر کو کہا سری یا بھی نیا ہے آہستہ آہستہ سیکھ جائے گا۔ میں نے کہا جناب مجھے گالی اپنے معاشرے نے سکھائی نہ اس جیل کے معاشرے میں سیکھوں گا۔ اس موقع پر میں نے مذاق کرتے ہوئے کہا کہ ویسے جیل انتظامیہ کا فرض بھی ہے کہ وہ قیدیوں کو بہتر انسان بنانا کرسو سائی میں واپس بھیجے۔ بالکل۔ بالکل۔ سیکورٹی چیف نے کہا۔

ملقاتوں پر ہوم افس کی عائد کردہ پابندیوں اور خطوط کی سنر شپ ختم کرنے کا اختیار گورنر کے پاس نہ تھا۔ بات چیت کے زریعے جب ان پابندیوں کے خاتمے میں ہم ناکام ہوئے تو ریاض ملک۔ صدقیق بھٹی اور میں نے بھوک ہڑتال کر دی۔ چند دیگر انگریز قیدیوں نے بھی ہماری حمایت میں بھوک ہڑتال کر دی۔ گورنر گڈوین دوسرا صحیح آئے اور کہا عقلمند لوگوں نے یہم عقلیاں کیے شروع کر دیں؟ میں نے کہا آپ نے خود ہی کہا تھا کہ یہ معاملات آپ کے دائرہ اختیار میں نہیں۔ وزارت

داخلہ تک اپنی آواز پہنچانے کا ہمارے پاس اور کوئی طریقہ نہیں۔ کشمیری کمیٹی لیڈر ان نے بھی اپنے
 اپنے رکن پارلیمنٹ کو ہماری بھوک ہڑتال بارے تایا جنہوں نے وزیر داخلہ پر دباؤ ڈالا ان کے اس
 اقدام کو میڈیا نے بھی ہائی لائٹ کیا۔ اگر یہ قیدیوں کی نظر میں ہماری قوت میں اضافہ ہوا جو سونے
 لگے کہ ہم واقعی سیاسی قیدی ہیں جن کے ساتھ اچھے تعلقات کی وجہ سے انہیں بھی فاہدہ ہو سکتا ہے۔ ہم
 ہائی رسک قیدی تھے۔ یہ کمیٹی ختم ہوئے بغیر ہمیں عام قیدیوں کی سہولتیں تو نہ ملتی تھیں اور نہ ہی
 سنسنر شپ کا خاتمه ہو سکتا تھا لیکن ہوم افس کی بدائیت پر گورنر نے مجھ سے تحریری تجویز مانگتیں۔ میں
 نے کہا جو کہ ہمارے ملاقاتیوں کی منظوری میں ہوم آفس ایک سال تک کا عرصہ لگادیتا ہے اس لیے یہ
 مدت بھی کم کی جائے اور بیرون برطانیہ ملاقاتی مختصر عرصے کے لیے آتے ہیں اس لیے انہیں امیگریشن
 اگر ہوائی اڈہ پر پاسپورٹ دیکھ کر انتہی دیتی ہے تو جیل انتظامیہ کو بھی پاسپورٹ دیکھ کر ہم سے ملاقات
 کی اجازت دینی چاہیے۔ انگلش خطوط جس دن آئیں اسی دن ہمیں اسی دن ہمیں دیے جائیں اور
 دوسری زبانوں میں تین ماہ میں خطوط کے ترجمہ کا وقت کم سے کم کیا جائے۔ یہ دونوں تجویز مان لی
 گئیں اور مذہبی فرائض کی ادائیگی پر عائد پابندیوں میں بھی نرمی کا وعدہ کیا گیا۔ بعض جیل افسران
 کثروں فریک ہوجاتے ہیں یعنی اپنی طرح کے انسانوں کو کثروں کرنے کا بھوت سوار ہو جاتا ہے
 ایسے افسران قیدیوں کے مطالبات منظور ہونے پر یوں ہی اپنا دل و دماغ جلاتے رہتے ہیں۔ وہ
 قیدی کو تنگ کرنے کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتے۔ ایک دن صدیق بھٹی بال کٹوار ہے تھے کہ ایک
 سیکورٹی افسر نے ان سے بدکلامی کرتے ہوئے کہا کہ بال کٹوانے میں زیادہ وقت کیوں لگایا۔ صدیق
 بھٹی نے کہا بال بار برکاث رہا ہے جو کہنا ہے اسے کہو۔ اس پر سیکورٹی افسر مزید سخن پا ہوا اور دشام
 طرازی پر اتر آیا۔ گورنر نے ہم سے وعدہ کیا ہوا تھا کہ آئندہ ہم سے کوئی افسر بدکلامی نہیں کرے گا اس
 لیے گورنر کو شرمندہ ہونا پڑا۔ اس نے جیل افسر کی سرزنش کی۔ فقر میں بلا کر مجھے کہا کہ صدیق بھٹی سے
 بات کروں کہ اس نے جیل افسر کو سبق سکھانے کی دھمکی دی ہے وہ واپس لے۔ چونکہ ہم الگ الگ
 سیلوں میں بند تھے اس لیے مجھے اس دھمکی کا علم نہیں تھا۔ میں نے گوزر سے پوچھا کہ دھمکی کیا تھی تو اس
 نے کہا صدیق نے کہا ہے کہ وہ بھی بر میگھم کا باسی ہے وہ معلوم کروالے گا کہ اس سے بدکلامی کرنے والا
 جیلر کہاں رہتا ہے۔ میرے بعد گورنر نے صدیق کو بلا یا تو میں نے صدیق کو اشارہ کر دیا کہ جیلر
 خائن ہے اور گورنر ہمارے حق میں ہے۔ اب مان لینا۔ جیلر کافی عمر کا تھا۔ صدیق بھٹی نے گورنر کو کہا

کہ ہمارے معاشرے میں بزرگوں سے جھگڑا نہیں کیا جاتا۔ گورنر بہت محفوظ ہوا اور ہم سبکا پہلے سے زیادہ عزت و احترام کرنے لگا۔ اس وقت ہم خود جوان تھے تو جیل کو بوڑھا سمجھتے تھے۔ اب ۳۸ سال بعد ہم اس جیل سے بھی زیادہ عمر کے ہو گئے ہیں لیکن پھر بھی خود کہتا ہے تم ابھی جوان ہو۔

گورنر گڈوین کو سکھ ہید ماسٹر کی روپورٹ کی روشنی اور جیل میں ہمارے طرز عمل سے جب یقین ہو گیا کہ ہم کوئی پیشہ و رجنم نہیں بلکہ جوں کشمیر پر غاصبانہ قبضے کے خلاف ہیں تو گورنر نے اپنے سٹاف کو ہدایت کی کہ ہم اگر سٹاف کے لیے کوئی مسئلہ نہیں پیدا کرتے تو سٹاف کو بھی ہمیں شکایت کا موقع نہیں دینا چاہیے اور نہ ہی ہمارے سیاسی معاملات پر ہم سے بحث کرنی چاہیے۔ ہمیں معلوم نہیں گورنر گڈوین نے جیل کی انٹرکشن بک میں مزید کیا لکھا لیکن اس کے بعد اس جیل میں کسی بھی داروغہ نے ہمارے ساتھ بدکلامی نہ کی البتہ ہم پر عائد پابندیوں میں کسی قسم کی کمی واقع نہ ہوئی۔

ہمارے ریاستی نظام میں تعلقات اداروں پر اتنے حاوی ہو جاتے ہیں کہ کرسی پر بیٹھے افسران اصول و قوائد نظر انداز کر دیتے ہیں لیکن انگریز اداروں کے اصول پر ذاتی تعلقات کو حاوی نہیں ہونے دیتے۔ اسی وجہ سے ان کے ادارے مظبوط ہیں۔ اس حقیقت کے باوجود کہ جیل انتظامیہ کی سالانہ رپورٹوں میں ہمیں ماذل قیدی قرار دیا جاتا تھا مگر سیاسی حالات کی وجہ سے ان رپورٹوں کا ہمیں کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ملاقات کی پابندیاں اتنی سخت تھیں کہ ہوم آفس کی طرف سے ملاقات منظور ہو جانے کے باوجود سیکورٹی کی سختی میں کسی قسم کی نرمی نہ آئی۔ ایک دن میرے بڑے بھائی نذیر راجہ ہالینڈ سے ہمراہ میگم اور چھ ماہ کی بچی مجھ سے ملے آئے۔ میں نے درخواست دی کہ وہ دوسرے ملک سے آئے ہیں اس لیے دس منٹ کی ملاقات میں اضافہ کیا جائے مگر ہوم آفس نے انکار کر دیا۔ میرے ملاقاتیوں کو ایک کنسٹرولڈ روم میں بٹھا کر مجھے وہاں لے جایا کرتے تھے۔ اس دفعہ جب میں ملاقاتی روم میں داخل ہوا تو اپنی چھ ماہ کی بچتی شمینہ کو میں اس کی والدہ سے لے کر گود میں ابھی بٹھایا ہی تھا کہ سیکورٹی افسران آئے اور مجھ سے بچی چھین لی۔ میں نے اعتراض کیا تو کہنے لگے یہ سیکورٹی اصول کے خلاف ہے۔ ایک عام ادمی تو یہی سوچے گا کہ چھ ماہ کی بچی کو گود میں بٹھانے سے کیسے سیکورٹی مسئلہ بن سکتا ہے لیکن جیل اصول کے مطابق مجھے بیکھیت قیدی میرے لیے مخصوص کر سی پر بیٹھنا تھا اور ملاقاتیوں کو ان کے لیے مخصوص کر سیوں پر۔ ہمارے محدود دس منٹ ضائع ہو رہے تھے اس لیے میں نے سیکورٹی سے بحث میں یہ وقت ضائع کرنے کے بجائے بھائی اور بھائی سے بات چیت کو ترجیح دی۔ سیل میں

والپس آ کر گورنگلڈ وین سے شکایت کی تو اس نے کہا سیکورٹی افسر کے پاس آ کپی ملاقاتوں کے بارے صواب دیدی اختیارات نہیں ہیں۔ میں نے وزیر داخلہ کو لکھا کہ جاری کردہ کتابت پچے میں ہوم آف نے جیل انتظامیہ کو ہدایت کی ہوئی ہے کہ قیدیوں اور سوسائٹی کے درمیان روابط مضبوط کیے جائیں تاکہ قیدیوں میں دوران قید ریاست مخالف رویے نہ پہنپیں لیکن عملی طور پر تو آپ قیدیوں کو اپنے خاندانوں سے بھی دور کھٹے ہیں۔ میں نے اپنے اوپر مسلط کردہ ہائی رسک کی پابندیوں کو بھی چیخنے کرنا چاہا لیکن فی الحال ہماری پہلی ترجیح سماحت کی تیاری تھی۔ انگریز فیصلے درخواست گزار کے حق میں کریں یا نہ کریں لیکن ان کے اس اصول کی تعریف کرنی پڑے گی کہ وہ ہر شکایت کا کوئی نہ کوئی حواب ضرور دیتے ہیں۔ جیل انتظامیہ ہمارے اس طریقہ کار کی بھی تعریف کرتی تھی کہ ہم کسی تباہ عرض پر عام قیدیوں کی طرح توڑ پھوڑ کے بجائے تحت ضابط تحریری شکایت کرتے تھے ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ اگر ہماری شکایت نظر انداز کی گئی تو ہم میڈیا سے بھی رجوع کریں گے۔ برطانوی میڈیا بھی قیدیوں کے حق میں وقتاً فوقتاً آواز بلند کرتا رہتا تھا۔ ہماری خفیہ سزاوں کی وجہ سے تو خیر بر لش میڈیا یا بہت ہی زیادہ برطانوی وزیر داخلہ کے خلاف ہو گیا تھا یورپ میں بے شمار ایسے ادارے موجود ہیں جو ریاستی جر کے خلاف متحرک رہتے ہیں چاہے مظلوم کا تعلق کسی بھی رنگ نسل اور مذہب و معاشرے سے ہو۔ ہماری کوشش ہوتی تھی کہ ہم خط و کتابت کے زریعے ایسے افراد و اداروں سے رابطہ میں رہیں۔

ہمیں ایک دوسرے سے الگ کیوں رکھا گیا؟

سماعت مکمل ہونے تک ریاض ملک صدیق بھٹی اور مجھے نسن گرین جیل بر مکنہم میں ہی رکھا گیا۔ ہم الگ سیلوں میں تھے۔ چھل قدمی کے لیے ہمارا الگ الگ وقت مقرر تھا۔ پیشی پر بھی ہمیں اکٹھے نہیں رکھا جاتا تھا صرف اٹھرے میں جاتے وقت بعض اوقات سلام دعا کا موقع مل جاتا تھا۔ ہمیں الگ الگ رکھنے کا واحد مقصد یہ تھا کہ ہم کوئی مشترکہ دفاعی بیان تیار نہ کر سکیں۔ امان اللہ خان کی مدد سے وہ اس مقصد میں کامیاب بھی ہو گئے کیونکہ امان اللہ خان نے مجھے اندر ہیرے میں رکھ کر صدیق بھٹی کو اقبال جرم پر امادہ کیا تھا جس کا مجھے اس وقت علم ہوا جب سماعت شروع ہوئی جہاں صدیق کے وکیل نے کہا کہ میرا موکل اپنا دفاع نہیں کرے گا۔ اقبال جرم کرنے والے پر جر ج نہیں ہوتی بلکہ صرف سزا نادی جاتی ہے۔ امان اللہ خان کا یہ دعویٰ کہ اقبال جرم کی صورت میں سزا کم ہو گی

اس وقت دھرے کا دھرارہ گیا جب صدیق بھٹی کو بارہ سال تک سزا اوابے جرم کی اٹھارہ سال سزا ہو گئی جواہیل پر چودہ کر دی گئی۔ اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ جمٹ میں لکھا گیا کہ صدیق بھٹی نے اقبال جرم اس لیے کیا کہ اس کا مقصد صرف اپنی ذات کو بچانا تھا جبکہ راجہ کے ذہن میں قومی کا ز تھا۔ سسری جمٹ کی کاپی میرے پاس محفوظ ہے۔ چند سال قبل مجھے صدیق بھٹی کے اس دعوے پر حیرت بھی ہوئی اور اس کی سادگی پر ترس بھی آیا جب اس نے جھنڈا کیس میں گرفتار تنور احمد کی گرفتاری کے دوران مقبول بٹ شہید چوک ڈڈیال میں میری موجودگی میں چند افراد سے کہا کہ اس نے اقبال جرم کر کے عقیندی کی اور خود کو طویل سزا سے بچالیا جبکہ میں اور ریاض نے برطانوی حکومت کو چلنگ کر کے اپنی سزا میں اضافہ کروادیا۔ مجھے لگتا ہے کہ اسے یہ تصور بھی کسی ناسمجھ دوست نے دیا۔ اصل صورت حال تو یہی کہ صدیق بھٹی پر صرف ان غواء کا الزام تھا جبکہ ریاض اور مجھ پر مہاترے کو غیر قانونی طور پر قید رکھنے اور قتل کرنے کے الزامات تھے۔ ہمیں سزا خفیہ ہوئی تھی جسے ایک بار پھر خفیہ طور پر روز یہدا خلمنے دس سال کے لیے بڑھا دیا تھا۔ ہم نے اپنی خفیہ سزا کو لندن ہائی کورٹ میں چینچ کیا جس نے خفیہ سزا کو کا عدم قرار دیا تھا۔ پھر بھی جب ہمیں بری نہ کیا گیا تو ہم نے برطانوی حکومت کو یورپی انسانی حقوق کی عدالت میں چینچ کیا جس نے ریاض کو میں اور مجھے با میں سال بعد بری کیا۔ ان حقائق کی روشنی میں اپنے ساتھی کی بتیں سن کر بہت افسوس ہوا لیکن اب ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ کچھ لوگوں نے اسے مشورہ دیا کہ اگر تمہیں کوئی اقبال جرم کرنے کی وجہ پوچھتے تو بتاؤ تم نے اقبال جرم کر کے فائدہ حاصل کیا اور راجہ اور ریاض نے اقبال جرم نہ کر کے نقصان اٹھایا لیکن اس بے چارے کو یہ مشورہ دے کر اس کے ناسمجھ دوست اسے مزید شرمندہ کر رہے ہیں کیونکہ چند سادہ لوح افراد کو تو گمراہ کیا جا سکتا ہے مگر اس تاریخی کیس سے واقف، صاحب نظر اور فہم دفتر است کے مالک خود تحقیق کر سکتے ہیں۔ عام لوگ تو درکنار اسی خاندان سے تعلق رکھنے والے محاز رائے شماری کے صدر محترم عبدالخالق انصاری صاحب نے خجی محل میں اپنے خاندان کو کہا کہ ہم قیوم راجہ کے مجرم ہیں کہ ہمارے پھوپھوں کی وجہ سے وہ چھنس گیا۔ کسی نے کہا آپ تو یو کے میں نہیں تھے آپ کو کیسے پتہ تو محترم خالق انصاری صاحب نے فرمایا میں وکیل ہوں۔ میں نے کیس پڑھا ہے۔

چوتھا باب

کھلی عدالت کا خفیہ فیصلہ

دنیا میں ایسا بہت کم ہوا ہوگا جہاں سماحت تو کھلی عدالت میں ہوئی ہو مگر فیصلہ خفیہ ہوا ہو۔ برطانیہ نے کشمیریوں کے ساتھ یہ بھی کردکھایا۔ ہمارے کیس کی سماحت کراون کورٹ کے ایک نجی سر پیٹر برستو نے کی لیکن اسے فیصلہ سنانے سے یہ کہہ کر روک دیا گیا کہ وزیر داخلہ جلد ہمیں خود بخٹکھیں گے۔ پکھلوگوں کا خیال تھا کہ چونکہ ہمارے خلاف شواہد کم ہیں اس لیے شاید اس کا ہمیں فائدہ دے کر جلد بری کر دیں مگر ہمارا شک درست ثابت ہوا۔ وزیر داخلہ نے ہماری فائل ہی بند کر دی۔

ہماری سماحت ہماری گرفتاری کے ٹھیک ایک سال بعد ۱۶ جنوری سن پچاسی کوشروع ہوئی تھی۔ اگر کوئی قیدی اقبال جرم کر لے تو اسے سماحت مکمل ہونے کے بعد صرف سزا کے لیے بلا جاتا ہے اس لیے صدیق بھٹی۔ مجید انصاری اور جہانگیر مرزا سماحت کے لیے نہیں لائے جاتے تھے۔ ریاض ملک اور میں نے چونکہ اقبال جرم نہیں کیا تھا اس لیے ہمیں دو ہفتے لگا تار عدالت میں حاضر ہونا پڑا۔ دو ہفتے بعد سات فروری سن پچاسی کو کراون کورٹ برمنگھم کے نجی سر پیٹر برستو نے ہم چھ کشمیریوں کو عدالت میں طلب کیا۔ ہم مذکورہ پانچ تو جیلوں میں تھے جبکہ چھٹا کشمیری راجہ محمد اسحاق خان جو میرے کزن تھے وہ خمانت پر تھے۔ ان کے خلاف مجھے اپنے پاسپورٹ پر برطانیہ سے فرار کروانے کا الزام تھا۔ ان کے پاسپورٹ پر برطانیہ سے فرانس براستہ ہوئی ہیڈ بند رگاہ سفر کرنے کی دو وجوہات تھیں۔ اول۔ برٹش پولیس نے جب لوٹن انگلینڈ میں قائم جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کے دفتر پر چھپا پر مارا جو امان اللہ خان کی رہائش گاہ بھی تھی تو وہاں موجود فائلوں سے پولیس کو میری تصاویر ملیں۔

پولیس نے میری تلاش شروع کر دی۔ امان اللہ خان پر پولیس کا دباؤ راجہ قیوم کہاں ہے؟ برطانیہ میں جب میرا سراغ نہل سکا تو ہالینڈ میرے بھائی ندیر راجہ کی رہائش گاہ اور فرانس اور جمنی میں میرے دوستوں کے گھروں پر بھی چھاپے مارے گئے تھے۔ نہ ملنے پر تمام علمی ائر پورٹس اور بڑے زمینی راستوں پر میری تصاویر لگا دی کئی تھیں۔ ٹی وی چینز پر بھی سب سے پہلے میری تصویر نشر کی گئی۔ دوم۔ یہاں یہ بھی ایک اہم سوال ہے کہ جرمی اور فرانس کے میرے دوستوں کے گھروں کے پتے برٹش پولیس کو کس نے دیے؟ میرا اپنا پاسپورٹ ہوم آفس میں تھا۔ مہاترے کے اغوا اور قتل میں ریاض ملک اور میں ملوث نہ تھے لیکن قاتلوں کے بھاگ جانے کی وجہ سے اب صورت حال ایسی بن گئی تھی کہ ہم دونوں کے بچنے کا واحد راستہ یہ تھا کہ ہم اپنی جماعت اور ساتھیوں بشمول امان اللہ خان کے خلاف پولیس سے تعاون کرتے۔ امان اللہ خان کے اس فیصلے پر بے شمار لوگوں نے تنقید کی کہ انہوں نے دوسری فائدلوں کے ساتھ وہ فال بھی دفتر سے غائب کیوں نہ کی جس میں میری تصاویر تھیں اور مجھے بھی ان کی اس غلطی پر حیرت تھی۔ مہاترے کو گفت و شنید کہ نتاںج سامنے آنے سے پہلے ہی قتل کرنے والے جماعی ساتھیوں پر بھی ہمیں سخت غصہ تھا۔ امان اللہ خان کے منافقین بھی ہمیں مشورے دیتے تھے کہ سچ بتاؤ اور جان بچاؤ لیکن اب ان کی غلطیوں کے نتیجے میں ان کو گرفتار کروانا بھی ہمارے نزدیک تحریک اور کشمیریت کو بدنام کرانے کے مترادف تھا۔ ہمارے لیے یہ انتہائی مشکل مرحلہ تھا۔ ہمارے سامنے سوال یہ تھا کہ جماعت کو بچا نہیں یا خود کو؟ ہم نے جماعت کو بچانے کا فیصلہ کیا اور جماعت سے مطالبہ کیا کہ مہاترے کیس کی انکوائری کی جائے مگر امان اللہ خان نے بطور چھیر میں اور لبریشن فرنٹ برطانیہ زون کے صدر افضل جاتلوی، جزر سیکرٹری شیئر چوہدری اور آزاد کشمیر زون کے صدر سردار شید حسرت نے اس انکوائری کی مخالفت کی۔ میں نے احتجاج تو کیا مگر پہلے اپنی خفیہ سزا کے خلاف جدو جهد لازمی تھی۔ میں اس طویل اور مشکل قانونی جنگ میں مصروف ہو گیا جس میں امان اللہ خان جماعت کو میری مدد کی اجازت تو نہ دی البتہ انفرادی طور پر کچھ ساتھی میرے ساتھ تعاون کرتے رہے۔۔۔ جماعت کے مذکورہ عہدیدار انکوائری کے میرے مطالبے کی وجہ سے مجھ سے ناراض ہو کر کسی بھی قسم کی سیاسی، اخلاقی اور قانونی تعاون سے دستبردار ہو گئے تھے بلکہ اگر کسی نے مجھ سے ملاقات کی کوشش کی تو اسے بھی گمراہ کیا گیا جس کا ڈاکٹر مقصود احمد غوری صاحب نے اپنے بہنوئی غفور غوری کے جنازے پر ٹھیکیں سال بعد بھی زکر کیا۔ ڈاکٹر مقصود صاحب کا موقف تھا کہ

جب انہوں نے دیکھا کہ جماعت پر ایسے لوگ مسلط ہو گئے ہیں جو قوم راجہ جیسے شخص ساتھی جس نے اپنی زندگی داؤ پر لگا کر پوری جماعت کو بچایا ہے بھی ملخص نہیں تو وہ متعدد ملخص لوگوں کی طرح جماعت سے الگ ہو گئے البتہ ڈاکٹر شیر حسین میری رہائی تک مجھے کئی دوسرے محب وطنوں کی طرح ملتے رہے۔ میں ان تمام محب وطنوں اور انسان دوست ساتھیوں کا تاحیات دل و جان سے احترام کرتا رہوں گا۔ مشکل وقت کے ساتھیوں کو بھول جانے والا کم ظرف ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے بھی اس کم ظرفی کا شکار نہ کرے!

جن دنوں ہم گرفتار ہوئے ان دنوں ہمیں کشمیری پس منظر کے مالک کسی پر یکٹنگ و کیل کا کوئی علم نہیں تھا دورانِ ریمانڈ اور سماعت ہم سب حریت پسندوں کے وکلاء اگر یز تھے اور وہ بھی خیراتی۔ سعودی عرب سے بھی ہماری لیگل فیس کے لیے بھاری رقم پیش گئی جو سیاسی نمود و نمائش پر لگا دی گئی۔ سب وکلاء پر حکومت کا دباؤ تھا کہ وہ ریاض ملک اور مجھ سے بھی اقبال جرم کرو اکر سماعت ختم کروادیں۔ ہم نے ایسا نہ کیا البتہ ریاض نے اپنا محدود کردار کو تسلیم کیا اور قتل کی واردات سے مکمل انکار کیا۔ صدقی بھٹی نے اقبال جرم کرتے وقت میرے حق میں بیان دیا کہ جب مہاترے کو اغوا کیا گیا تو میں ساتھیوں تھا جس کی وجہ سے نج نے میرے خلاف اغوا کا الزام روک دیا جبکہ سازش کا الزام ثابت کرنے میں پولیس ناکام رہی۔ اس طرح میرے خلاف اب صرف دو ازمات رہ گئے تھے: مہاترے کی غیر قانونی حراست اور قتل۔ یہ تفصیل پچھلے صفحات میں بیان کر چکا ہوں کہ اس طرح ریاض ملک اور میرے خلاف کیس مضبوط کرنے کے لیے پولیس نے دو بے گناہ کشمیریوں مجید انصاری اور جہانگیر مرزا سے اقبال جرم کرو اکر عدالت میں استغاثہ نے ہم پر الزام لگایا کہ ہمارے خلاف شوائد ان دو جوانوں نے اس گھر سے ضائع کر دیے جس میں مہاترے کو قید رکھا گیا تھا جبکہ ریاض ملک اور مجھ پر قتل کے ازمات تباہ عائد ہوئے جب برطانوی حکومت کو فرار ہو جانے والے کشمیریوں کو برطانیہ واپس لانے میں ناکامی ہوئی۔ فرد جرم عائد کرنے کے بعد ہمارے ساتھ وکلاء کی ملاقاتوں میں تیزی آگئی تھی اور وکلاء نے ہی ہمیں بتایا تھا کہ برطانیہ کو جزء ضیاء کی حکومت کی طرف سے ثابت جواب نہیں ملا جس کے نتیجے میں اب تمام تر سیاسی و قانونی نزلہ مجھ اور ریاض پر گرے گا۔ فرد جرم عائد ہونے تک میرا وکیل جارج جونس تھا جو ایک بڑو قیمتی محضیر تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ استیبلشمنٹ کا آدمی تھا۔ وہ مجھے حوصلہ دینے یا میری رہائی کی راہ تلاش کرنے کے بجائے مجھے

نفسیاتی طور پر نزوس کرنے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ میں بھی اقبال جرم کروں۔ امان اللہ خان نے بھی دوران ملاقات کہا کہ جارج جونس کہتا ہے کہ اگر میں اقبال جرم کروں گا تو نجح کا رو یہ زم ہو جائے گا اور وہ سزا کم کر دے گا۔ جارج جونس سے زیادہ امان اللہ کو مجھے بھی اقبال جرم پر امادہ کرنے کا شوق تھا۔ میں نے کہا قتل کی سزا ہے ہی صرف عمر قید نجح کی کیسے کریگا؟ امان اللہ خان نے میری اس معلومات پر حیرت سے میری طرف دیکھا اور اٹھ کر چلے گے۔ پھر بھی والس نہ آئے۔ نجح کے فیصلہ نے بھی میرا موقف درست ثابت کر دیا کیونکہ صدقیق بھٹی کو بھی اقبال جرم کے باوجود جس جرم کی سزا ان دونوں میں بارہ سال تک بنتی تھی نجح نے اٹھا رہ سال دے دی اور اپیل کورٹ نے بھی اس میں صرف چار سال کی کمی کی۔

حکومت کے حامی وکیل مسلط کرنے کی مزید ناکام کوششیں

جارج جونس نام کے وکیل کا انتخاب امان اللہ خان نے کیا تھا۔ اس نے پہلی ملاقات میں ہی مجھے اقبال جرم کا مشورہ دے دیا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ رضا کارانہ مشورے نہ دے بلکہ مجھ سے پوچھئے کہ میرا کیس کیا ہے اور میری بحیثیت مولک کیا ہدایت ہیں لیکن اس کی غلطی نہیں تھی کیونکہ امان اللہ خان نے اسے یہ ہدایت دے کر بھیجا تھا کہ وہ مجھے اقبال جرم کے لیے قائل کرے۔ اس نے جب میری ہدایات پر عمل نہ کیا تو میں نے جارج جونس کو بر طرف کر دیا۔ چند دن بعد سیکورٹی کی ایک ٹیم میرے سیل میں داخل ہوئی۔ مجھے لباس تبدیل کرنے کے لیے کہا گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اب کچھ ہونے والا ہے کیونکہ جوں ہی میں نے وکیل کو بر طرف کیا تو میری راتوں کی نیزہ مشکل بنادی گئی تھی۔ رات کے سیکورٹی گارڈز اکثر اوقات سیکورٹی چیک اپ کے بھانے میرے دروازے پر بھاری جوتوں کی لک کار کر مجھے جگا دیتے تھے۔ میرے خدشات مزید پختہ ہونے لگے کہ حکومت اپنی مرضی کے وکلاء ہم پر مسلط کرنا چاہتی ہے جس کی وجہ سے اس نے جیل انتظامیہ کو ہمارے ساتھ رو یہ سخت کرنے کی ہدایت کی ہے وجہ بتائے بغیر مجھے بر مگھم کورٹ میں پیش کیا گیا جہاں ایک نجح نے کہا کہ میرے وکیل کی فیض حکومت ادا کرتی ہے اس لیے میں بار بار وکیل تبدیل نہیں کر سکتا۔ اس سے پہلے بھی میں ایک وکیل تبدیل کر چکا تھا جبکہ جارج جونس کو بھی میں نے اس شرط پر ایک موقع دیا تھا کہ وہ میری ہدایات کے مطابق میرا دفاع کرے گا مگر وہ اپنے وعدہ پر قاہم نہ رہ سکا جس کی وجہ سے میں

نے اسے دوسری اور آخری بار برو طرف کر دیا۔ نج نے جب کہا کہ وکیل کو فیں حکومت دیتی ہے تو میں نے کہا کہ اسکو یہ فیں میرے نام پر ملتی ہے اس لیے وکیل کو مولک کی مرضی کے مطابق کام کرنا پڑے گا۔ نج نے کہا وکیل قانون کو بہتر جانتا ہے جس پر میں نے کہا جناب اتنا تو میں بھی جانتا ہوں کہ اقبالی مجرم اور وعدہ معاف گواہ کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ نج نے پوچھا: پھر آپ کا دفاع کون کریگا؟ میں نے کہا میں خود کروں گا کیونکہ وکلاء تو مجھے پولیس اور استغاشی کی کہانی تسلیم کرنے پر مجبور کر رہے ہیں اس کہانی کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا۔ نج نے آخری سوال پوچھا: کیا میں جارج جونس کو آزاد کر دوں؟ میں نے کہا جی ہاں بڑی مہربانی ہو گی اور وو یہی بھی تو آپ بحیثیت نج کسی قیدی پر وکیل مسلط نہیں کر سکتے۔ نج غصہ کرنے کے بجائے زیر لب مسکرا دیا اور سیکورٹی کو کہا کہ اسے (مجھے) واپس جیل لے جائیں۔ مجھے پورا لیقین تھا کہ حکومت ہم پر وکیل مسلط نہیں کر سکتی لیکن ہمیں قابل اعتبار وکلاء کے لیے اپنے جماعتی ساتھیوں کے تعاون کی ضرورت تھی جو ہمارے لیے ہماری مرضی کے وکلاء تلاش کریں اور پھر یہی بھی کریں کہ وہ حکومت کے دباؤ میں نہ آئیں مگر بدقتی سے امام اللہ خان نے اپنے ارد گرد جو لوگ جمع کر رکھے تھے ان کی اپنی کوئی رائے نہ تھی اور پولیس ہمیں اپنی مرضی کے ملاقاتیوں سے ملاقات کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔ ہماری ملاقاتوں پر سخت پابندیاں تھیں۔ میری پیش ن گوئی تھی کہ حکومت مجھے خود اپنا دفاع کرنے کا رسک نہیں لے گی کیونکہ عدالت اور حکومت کو خطرہ تھا کہ اس طرح مجھے سیاسی بیان دینے کا کھلا موقع ملے گا۔ میرا اندازہ اس وقت درست ثابت ہو گیا جب ساعت شروع ہونے کے چند دن قبل میرے سیل کے دروازے کے نیچے سے ایک سرکاری خط اندر پھینکا گیا۔ یہ خط لیگل ایڈ بورڈ کی طرف سے تھا جس میں لکھا تھا کہ آپکی لیکل ایڈ منظور کر دی گئی ہے جس پر میں کھل کے ہنسا کیونکہ میں نے ایسی کوئی درخواست دی ہی نہیں تھی۔ میں نے کسی طرح باز پیغام بھیجا جس کے نتیجے میں ہمارے ایک جماعتی ساتھی نظام بھٹی نے اپنے دوست طارق علی کی واقف ایک ایسی خاتون وکیل کا نام اور پتہ بھیجا جو متعدد آرٹش قیدیوں کی نمائندگی کرچکی تھی اور ریاستی جر کے خلاف سخت موقف رکھنے اور سیاسی دباؤ کے آگے ڈٹ جانے میں شہرت رکھتی تھی۔ اس نے شہریوں کو ملکہ برطانیہ کی طرف سے ملنے والے خطاب کو یہ کہہ کر رد کر دیا تھا کہ اس کی ملکہ کے لیے کوئی خدمات نہیں ہیں! اس نامور خاتون وکیل کا نام گیر تھے پیرس تھا جس نے کیس تیار کر کے ہاؤس آف لا رڈز کے ایک رکن بیرون گورڈ کو بھیج دیا۔ برطانیہ میں وکیل صرف محض ہیٹ کورٹ میں جراحت سکتا ہے جبکہ کراون اور ہائی

کورٹ میں بیرٹریہ کام کرتا ہے۔ گیر تھہ اور گفروڑ پہلی ملاقات میں میرے ساتھ کیس کے قانونی پہلو سے ہٹ کر ذاتی اور سیاسی گفتگو کرتے رہے۔ لارڈ گفروڑ نے ایک سیاہ فام خاتون سے شادی کی ہوئی تھی اور اپنے آپ کو ایک لبرل اور انصاف پسند انگریز ثابت کرنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ دوران سماعت بریک کے وقت صرف میرے دکاء کی ٹیم میرے سیل میں آتی اور میرے ساتھی گفتگو کرتے رہتے جبکہ ریاض ملک کے دکاء کٹشن میں چلے جاتے۔ ان مختلف رویوں کی صرف یہ وجہ تھی کہ گیر تھہ اور گفروڑ برطانیہ کی بعض سامر اجی پالیسیوں سے اختلاف رکھتے تھے مگر سماعت کے فیصلہ کن مرحلے پر جج سر پیٹر برستو نے لارڈ گفروڑ پر بھی دباؤ ڈالا کہ وہ مجھے مدد و اور حخصوص بیان دینے پر قائل کرے۔ مثال کے طور پر میں نے جب عدالت میں پولیس شددا کاز کرتے ہوئے سوال اٹھایا کہ پولیس نے میری گرفتاری کے بارہ گھنٹے بعد لیے جانے والے انٹرویو میں مجھ پر الزام لگایا کہ لیبارٹری ٹیسٹ کے مطابق میرے کپڑوں کا فائنس ظائز کرتا ہے کہ میرے اور مہاترے کے کپڑوں کا آپس میں ٹکراؤ ہوا تھا جبکہ لیبارٹری کی روپرٹ پولیس کو میری گرفتاری کے ایک ہفتہ بعد ملی تھی

جج کو اس وقت بڑی تکلیف اور پولیس کو شرمندگی ہوئی جب میں نے عدالت میں اپنا بیان ریکارڈ کرواتے وقت سوال اٹھایا کہ لیبارٹری میں میرے کپڑے کچھ سے پہلے ہی پولیس نے کس بنیاد پر لیبارٹری ٹیسٹ کا نتیجہ بتا دیا جس کا زکر پولیس نے میرے ساتھ پہلے انٹرویو کی روپرٹ میں کر دیا تھا۔ میرے بیان کے تسلسل کو توڑنے کے لیے جج نے بریک کر کے میرے بیرٹر لارڈ گفروڑ کو چیمبر میں بلا کر مجھے پولیس کے خلاف بیان دینے سے منع کرنے کا مشورہ دیا حالانکہ میں نے بہتان تراشی نہیں کی تھی بلکہ ایک منطقی سوال اٹھایا تھا۔ یہ بھی جج کی جانبداری کی ایک مثال ہے۔ اس وقت جلتی پر تیل والا منظر بن گیا جب دوران وقفہ بی بی سی ریڈیو کی ایک انگریز روپرٹ را بیار اپنس نے میرے عدالتی بیان کا کچھ حصہ سننے کے بعد ہی اس روز ایک بجے کی خبروں میں ہیڈ لائنس لگوائی کہ "WRONG MAN CHARGED WITH MURDER"۔ لگتا تھا کہ اس خبر کے بعد بی بی سی کا گلا بھی کسی نے دبادیا تھا۔ اس کے بعد بی بی سی نے پولیس کے خلاف نہ ہمارے حق میں روپرٹنگ کی۔ صرف سماعت کی کاروائی کا زکر ہوتا رہا مگر پس پر دہہ، ہم پر جو دباؤ ڈالا جا رہا تھا اور جو کھلیل کھلیلے جا رہے تھے وہ جانے کے لیے میڈیا کو ہم سے بات کرنے کی اجازت نہ تھی لیکن یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ بی بی سی کا ذہن ہمارے حق میں ہو چکا تھا۔ برطانیہ میں گھر اخبار کا درجہ رکھنے والے

روزنامہ سن کے علاوہ کسی اخبار نے ہمارے لیے دہشت گرد کا لفظ استعمال نہ کیا بلکہ تین صحافیوں پر مشتمل ایک میڈیا ٹیم نے جموں کشمیر پر ایک دردناک تحقیقی رپورٹ شائع کرتے ہوئے لکھا کہ یہ کشمیری نوجوان یورپ میں آرام دہ زندگی گزار رہے تھے اور اعلیٰ تعليٰ اداروں میں زیر تعلیم تھے لیکن کشمیریوں کے ساتھ ہونے والی نا انسانی نے ہزاروں میل دوران کی زندگیوں کو بھی متاثر کیا۔ شاید ان کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ برطانیہ میں یعنی والے باقی کشمیریوں کو بھی مسئلہ کشمیر متحرک رکھے گا جس کا اثر برطانیہ پر پڑ سکتا تھا اس لیے برطانیہ اس کے حل میں کردار ادا کرے۔ (برطانیہ کے خارجہ امور کے وزیر نے بھی پتیس سال بعد چند ماہ قبل میرے ایک خط کے جواب میں لکھا کہ وہ چاہتے ہیں کہ برطانیہ میں آباد بھارتی۔ پاکستانی اور کشمیری کمیونٹیز کے درمیان ہم آہنگی ہو) میرا بیرونی سڑک را روڑ گفروڑ کافی پریشان لگ رہا تھا۔ ایک طرف وہ اپنے بارے ایک اچھے کیل اور قدامت پسندانہ اور توسعے پسندانہ پالیسیوں کے خلاف بeryl شخص کا متع قائم رکھنا چاہتا تھا تو دوسرا طرف وہ نج کا خنیہ پیغام بھی مجھ تک پہنچانے پر مجبور نظر آ رہا تھا۔ کیوں یعنی کوئی کوئی کوئی لارڈ گفروڑ کے ساتھ میرا رو یہ اس لیے نہ رہا کہ ایک تو وہ مجھے صرف نج کا پیغام دیتا تھا اور فیصلے کا اختیار مجھ پر چھوڑ رکھا تھا دوسرا میں سوچ رہا تھا کہ میری جماعت کی قیادت مصلحت کا شکار ہو گئی ہے تو میں دوسروں سے کیا شکوہ کر سکتا ہوں۔ یوں تو بے شمار سیاسی و تحریکی سوچ کے مالک کشمیریوں نے سوال اٹھایا کہ آخر فرنٹ کی اس وقت کی قیادت نے کیوں مہاترے کیس کے کچھ کرداروں کو اقبال جرم پر قائل کیا لیکن تنظیم کے اندر اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کے بجائے پاکستان کے ایک سیاسدان چوہدری شجاعت کی طرح مٹی پاؤ کی پالیسی پر گامز رہی۔ کارکنوں کے سامنے جب بھی کسی نے حقائق رکھنے کی کوشش کی تو اس کے خلاف پروپیگنڈا کیا گیا کہ جی یہ صاحب اب جماعت کے خلاف ہو گئے ہیں لیکن اس سوال کا کبھی جواب نہ دے سکے کہ اپنے خون سے جماعت کی آبیاری کرنے والے کیوں خلاف ہو گئے ہیں؟

میں نے پوری برطانوی قوم کو کیوں مجرم قرار دیا؟

لارڈ گفروڑ کا کہنا تھا کہ فیصلہ میں نے خود ہی کرنا ہے لیکن نج کہتا ہے کہ یہ فیصلہ کرنا میرا آخري موقع ہے کہ میں اپنا دفاع کروں گا یا دوسروں کا؟ اس سوال کا جواب میرے لیے مشکل تھا اور آسان بھی۔ مشکل اس لیے کہ اکثر لوگ سب سے پہلے اپنی جان بچاتے ہیں اور میں ساتھیوں کو بھی

بچانے کی کوشش کر رہا تھا جبکہ آسان اس لیے کہ غیرت مند و محب وطن سب سے پہلے قومی و قارکا خیال رکھتے ہیں۔ جو نیز خاتون بیرونی عزماً بل عدالت کے نیچے زمین دوزیل میں میرے پاس آئی اور کہا مسٹر راجہ سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں۔ ہمارا کام آپ کا دفاع کرنا ہے اور آپ کی لیگل ٹیم کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ہم آپ کو قبل از وقت بتائیں کہ آپ نے اگر اپنی پارٹی کا دفاع جاری رکھا تو سارا الزام آپ کے سراۓ گا جس کے نتیجے میں آپ طویل مدت تک جیل میں رہیں گے۔ جب میں نے اسکے مشوروں کو سنتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تو اس نے کہا شاید حقیقی آپ کی عمر ہے اس سے بھی زیادہ عرصہ آپ جیل میں رہیں۔ میں نے اس خاتون کو کہا نجح صاحب کا مطلب تو یہی ہے نا کہ مجھے خود کو بچانے کے لیے پر اسکیوں شنس یعنی وعدہ معاف گواہ بنانا پڑے گا۔ جواب ملا جی ہاں۔ ایسا ہی ہے۔ میں نے کہا وعدہ معاف گواہ کی کیا زندگی ہوتی ہے۔ غداری کے داغ سے بڑی تو مجھے کوئی سزا نظر نہیں آتی۔ میں نے مہاترے قتل نہیں کیا اور قاتل کو پکڑنا پولیس کا کام ہے۔ بیرونی نے مداخلت کرتے ہوئے کہا مگر مسٹر راجہ نجح جانا چاہتا ہے کہ پلان میں کون کون ملوث ہے۔ نجح کو پورا یقین ہے کہ آپ سب کچھ جانتے ہیں۔ آپ کا شمار لبریشن فرنٹ کے سینئر اور متحرک لوگوں میں ہوتا ہے۔ قانون کے مطابق انصاف کی راہ میں رکاوٹ بننے والا بھی مجرم ہے۔ بیرونی کا تناکہ کہنا تھا کہ میر اخوان کھول گیا۔ میں نے کہا پھر تو آپ سب اور آپ کی ساری قوم مجرم ہے۔ دونوں بیرونیز آنکھیں چھاڑ پھاڑ کر میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ہاں آپ سب کیونکہ برطانیہ نے ہماری ریاست کے ساتھ جو نا انصافی کی ہے اسی کی وجہ سے آج میں اور میرے ساتھی اس بے انصاف نجح کے سامنے کھڑے ہیں جس کی پولیس میرے خلاف قتل ثابت نہیں کر سکی اور وہ پھر بھی وہ کہتا ہے سچ بتاؤ۔ جاؤ نجح کو بتاؤ کہ وہ استغاثہ کو بولے کہ وہ میرے خلاف قتل ثابت کرے۔ سیل کے اندر میرے ساتھ پر بیٹھے ہوئے دونوں بیرونیز پیچھے ہٹ کر دیوار کے ساتھ لیک لگا کر چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گے۔ فوری میرے ذہن میں خیال گزرا کہ میری طرف سے پوری انگریز قوم کو موردا الزام ٹھرانے سے شاید میرے ولیوں کو دکھ ہوا ہوگا مگر تھوڑا توقف سے سینئر بیرونیز لارڈ گنورڈ نے اپنے گھنٹوں پر ہاتھوں کی کنگلی کھوی اور انتہائی دھیمے انداز میں مجھے کہا مسٹر راجہ ہمیں احساس ہے کہ کشمیری قوم کے ساتھ بہت زیاد تیاں ہوئی ہیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ آپ کوئی پیشہ ور مجرم نہیں ہیں لیکن برطانیہ پر بھارت کا سخت دباؤ ہے۔ برطانیہ میں ٹوری پارٹی کی حکومت ہے۔ یہ قدامت پسند لوگ ہیں۔ نجح بھی

اسی سوچ کا مالک ہے۔ اندر اگاندی اور مار گریٹ تھیج بھی مسلسل رابطے میں ہیں۔ یہ سارے صرف کسی ادمی کو جیل بھیج کر بھارت کو مطمئن کرنا چاہتے ہیں۔ نج اس بات پر اڑا ہوا ہے کہ مسٹر راجہ کو سب پتہ ہے۔ نج کے نزدیک سیدھا سادہ سوال یہ ہے کہ مسٹر راجہ پناہ دافع کرے گا یا بریشن فرنٹ کا؟

بریشن فرنٹ کے خلاف بیان دلوانے کی کوشش کی اصل وجہ؟

بریشن فرنٹ کے خلاف مجھ سے بیان دلوانے کے پیچھے اصل میں بھارت کا ساتھ تھا تاکہ وہ میرے بیان کو بنیاد بنا کر ب्रطانیہ پر دباؤ ڈالے کہ بریشن فرنٹ ایک دہشت گرد تنظیم ہے اور ب्रطانیہ اسے بینڈ کرے۔ اس موقع پر میں نے اپنے دل و دماغ میں ساری باتیں وکیلوں کے ساتھ شیئر کرنے سے اجتناب کیا۔ یہ وہ لمحات تھے جہاں سائے پر بھی اعتبار کرنا مشکل تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ بریشن ارمی کے بجائے بریشن فرنٹ کو ذمہ دار ہے اور امان اللہ خان سمیت فرنٹ کے بہت سارے مرکزی لوگ گرفتار ہو جائیں گے اور فرنٹ ب्रطانیہ میں بینڈ ہو جائے گی۔ اس سے بہت بڑا سیاسی نقصان اور میری ذاتی بدنامی ہو گی کیونکہ عوام کو تو معلوم نہیں ہو گا کہ میرے ساتھ بھی قیادت نے دھوکہ کیا بلکہ جب گرفتاریاں ہوں گی تو صورت حال میرے خلاف ہو جائے گی۔ حقیقت یہی تھی کہ بریشن ارمی کا نام امان اللہ خان کی ذہنی اختراع تھی لیکن میرے بارے میں ان کا موقف تھا کہ میں صرف سیاسی و نگ میں رہوں۔ یہی وجہ تھی کہ مہاترے کے اغوا کے وقت میرا پا سپورٹ ہوم آفس میں تھا اور اگر میں ایک پلان کے تحت بریشن ارمی میں شامل ہوتا تو میں اپنا پا سپورٹ ہوم آفس میں بھیج کر مہاترے کیس میں ملوث نہ ہوتا مگر یہ سب کچھ کیسے اور کیوں ہو؟ اکہانی طویل ہے مگر مختصر یہ کہ میں نے مہاترے سے ملاقات کے بعد منظر عام پر آ جانا تھا لیکن جس ادمی نے میری جگہ ریاض کے ساتھ مہاترے کی دیکھ بھال کرنی تھی وہ تین دن تک واپس نہ آیا اور جب آیا تو مہاترے کو گولی مار دی؟ یہاں یہ زکر کرنا مقصود ہے کہ نج چاہتا تھا کہ میں بیان دوں کہ بریشن ارمی بریشن فرنٹ کا ہی دوسرا نام ہے اور اس کی بنیاد بریشن فرنٹ کی قیادت نے ہی رکھی تھی تاکہ بریشن فرنٹ پر پابندی عائد کرنے کی بھارتی خواںش پوری کرنے کا جواز پیدا کیا جائے۔ گوہارے کچھ ساتھیوں نے اقبال جرم کیا مگر بریشن فرنٹ کو بچانے میں ان کا بھی بھرپور کردار ہے۔

ٹرائل نجح کا آخری خطاب

ٹرائل نجح سر پیٹر برستو نے ریاض ملک اور میری دو ہفتواں کی سماحت کے دوران ہمیں وعدہ معاف گواہ بنانے کی تمام کوششوں کی ناکامی کے بعد اب آخری لمحات میں وہ یہ تشریف دینے کی کوشش کرنے لگا کہ بريطانیہ ایک مہذب ملک اور عدالیہ آزاد ہے۔ سات فروری سن پیچا سی کی صبح نجح نے ہم چھ کشمیریوں کو عدالت میں طلب کیا۔ کمرہ عدالت اور دوسری منزل پر بڑی گلیری دنیا بھر کی پریس اور دیگر متعلقین سے کھپا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ عدالت کے نیچے سیلوں میں منتظر ہم چھ قیدیوں کو لائے میں کھڑا کیا گیا۔ ترتیب کچھ اس طرح تھی: عبدالقیوم راجہ، ملک محمد ریاض، صدیقی بھٹی، مجید انصاری، جہانگیر مرزا اور راجہ محمد اسحاق۔ نجح نے نظریں اٹھ کر گلیری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا میں کشمیر کی ٹریجڈی سے واقف ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ جب کوئی دیکھے کہ اس کے لوگوں کے ساتھ نا انصافی ہو رہی ہے تو وہ کوئی بھی اقدام اٹھانے کے لیے تیار ہو جاتا ہے لیکن بطور نجح مجھے یہ نہیں دیکھنا کہ کشمیر میں کیا ہوا بلکہ یہ کہ بريطانیہ میں کیا ہوا اور یہاں کا قانون مجھے کیا کہتا ہے۔ اس موقع پر میرا جی چاہتا تھا کہ میں کھڑا ہو کر نجح سے پوچھوں کہ کیا تمہارے لوگوں نے ہمارے ملک پر قبضہ کرتے وقت ہمارے قانون کا احترام کیا تھا لیکن ہم بھارتی سیکورٹی کے زخم میں تھے۔ دل پر پھر رکھ کر ہم اس کی منافقانہ گفتگو سنتے رہے۔ آخر میں سب سے پہلے نجح نے مجھ پر بم گرانے کے لیے سیکورٹی کو کہا: فرست۔ آئی وانت راجہ۔ سیکورٹی نے مجھے کھڑا ہونے کے لیے کہا۔ نجح نے مجھے کہا مسٹر راجہ۔ آپ کو سماحت کے نتیجہ کا علم ہے۔ مجھے نہیں معلوم آپ کتنا عرصہ جیبل میں رہیں گے۔ ہوم نشر نے صبح مجھے فون کیا ہے۔ وہ خود آپ کو خط لکھیں گے (مگر وہ خط کبھی نہ آیا)۔ نجح نے سیکورٹی کو حکم دیا: ٹیک ھم ڈاؤن۔ اسے نیچے لے جاؤ۔ میں نے فتح کا نشان بنایا تو سیکورٹی نے چھپت کر میرا بازو پکڑ لیا۔ بريطانی روزنامہ گارڈین نے خبر لگائی: قیوم راجہ کا قوم کو بہادرانہ سلوٹ۔ پھر باری باری دوسرے ساتھیوں کو بھی سزا سنا کر نیچے سیلوں میں لا یا گیا۔ صدیقی بھٹی کو اٹھا راں سال، مجید اور جہانگیر کو پانچ پانچ اور اسحاق کو پانچ سو پونڈ جرمانہ ہوا جبکہ جیسا کہ پہلے زکر ہو چکا ہے، میری اور ریاض کی سزا خفیہ کر دی گئی۔ سزا کے فوری بعد میری وکیل گیر تجوہ پیرس جب میرے سیل میں آئی تو میں ترمیں میں سیف الملوك سے دل بہلا رہا تھا: کی ہو یا جے میں قیدی ہو یا، قید سدانی رہنا۔ گیر تھے نے سن کر جیعت سے

کہا آواز تو اچھی ہے مگر خوشی نہیں دکھ کا مقام ہے۔ میں نے کہا ہم حریت پسند ہیں ہم نا انصافی کے آگے تھیا رہیں ڈالیں گے۔ اللہ تعالیٰ کی مدد سے آخری لمحہ تک ہم اپنے عہد پر قائم رہے۔

عدالت سے واپس جیل تک

عدالتی فیصلے کے بعد ہمیں ایک سیکورٹی کا نوائے واپس جیل لے گیا۔ سیکورٹی وین کے اندر متعدد پنجرے بننے ہوئے تھے اور ہر قیدی کو الگ پنجرے میں بند کیا گیا تھا۔ راستے میں ہم انقلابی گانے گاتے رہے تاکہ سیکورٹی یہ سوچے کہ ہم سزا سے پریشان ہو گئے ہیں۔ قیدی کو جیل سیکورٹی سے اپنے جذبات چھپانے پڑتے ہیں کیونکہ جیل میں قیدی کی ہر کمزوری کو اس کے خلاف استعمال کیا جاتا ہے۔ انسانی رویوں پر تحقیق کرنے والے ماڑین نفیسیات کو بھاری اخراجات کے بل بوتے پر تجربہ گائیں قائم کرنی پڑتی ہیں لیکن جیل ایسے ماڑین کے لیے ایک مشابی جگہ ہوتی ہے جہاں قیدی کو آسانی سے کنڈیشن کر لیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر امریکہ اور روس کے ماڑین نفیسیات نے کاسیکل کنڈیشنگ کے لیے جانوروں پر تحقیق کی۔ روس کے ماڑین نفیسیات پاولونے ایک کٹے پر تحقیق کی جس کے منہ کو باندھ کروہ اس کے سامنے طرح طرح کے کھانے رکھتا اور دیکھتا کہ وہ کھانے کے لیے کیسی کسی حرکتیں کرتا ہے۔ امریکی ماڑین بلیوں کو ایک پنجرے میں بند کر پنجرے کے کونے میں گھٹنی نصب کر دیتے۔ انہوں نے بلی کو سکھایا کہ گھٹنی بننے پر وہ کھانے کے لیے آسکتی ہے۔ جب بلی کا دماغ کنڈیشن ہو گیا تو ماڑین گھٹنی تو بجائے مگر کھانا نہ رکھتے۔ اس پر تڑپتی اور کھانے والی جگہ پر پنجے مارتی۔ اس مثال کا یہ مطلب بھی نہیں کہ سارے ماڑین نفیسیات سندل ہوتے ہیں بلکہ یہ بتانا ہے کہ جہاں ماڑین نفیسیات انسان کو ادویات سے آزادی حاصل کرنے اور خود انحصاری کا ہست سیکھاتے ہیں وہاں ایسے ماڑین بھی ہوتے ہیں جو انسانوں پر بھی ایسے تجربے کرتے ہیں جیسے جانوروں پر۔

خفیہ سزا کے بعد کی کہانی

سزا کے بعد اکثر قیدیوں کی حوصلہ افرائی کی جاتی ہے تاکہ وہ جبل میں توڑ پھوڑ نہ کریں لیکن ایک سکھ اور آرٹش افسر کے علاوہ باقی ستاف نے الٹاہمیں اشتغال دے کر ہمارا عمل جانے کی کوشش کی۔ عدالت سے سزا کے بعد واپس جبل میں سب سے پہلے ڈاکٹر قیدی کوکل کر دیکھتا ہے کہ آیا اس کے دماغ پر کوئی اثر تو نہیں پڑا لیکن ڈاکٹر نے مجھے عجیب انداز میں پوچھا آج کیا ہوا؟ میں نے کہا ہمیں مجرم قرار دیا گیا مگر سزا نہیں بتائی گئی۔ ڈاکٹر نے ہندی میں پوچھا تمہارا کھوپڑی توٹھیک ہے نا؟ میں نے کہا آپ ڈاکٹر ہیں آپ بتائیں ٹھیک ہے کہ نہیں۔ کہنے لگا مجھے تمہارا کھوپڑی توٹھیک نہیں لگتا۔ پوچھا کیوں تو کہنے لگا۔ ارے بھیا تمہارا کھوپڑی ٹھیک ہوتا تو اتنی لمبی سزا لے کے آتا۔ میں نے کہا سزا تو نج نے دی ہے نا۔ ڈاکٹر نے کہا ہاں ہاں مگر تم اگر قانون نہ توڑتا تو سزا نہ ہوتی۔ میں نے سوچا یہ مجھے اشتغال دے رہا ہے کیوں نامیں بھی اس کا امتحان لے لوں۔ میں نے کہا ڈاکٹر صاحب۔۔۔ مجھے آپ کی کھوپڑی ٹھیک نہیں لگتی۔ کیوں کیا بات ہے؟ ڈاکٹر چلایا۔ میں نے کہا سزا تو بآپ جی (مہاتما گاندی) اور پنڈت جی کو بھی ہوئی تھی۔ اس پر بھارتی ڈاکٹر کی بس ہو گئی۔ میں نے اس کے ساتھ ایک اور شرارت کرتے ہوئے اس کی ناک کے اوپر لٹکلی باندھی تو اس نے سوال یہ نظر وہ سے میری طرف دیکھا؟ میں نے کہا ڈاکٹر صاحب آپ کی بیگم بڑی بے رحم ہے۔ وہ تو آپ سے بیار نہیں کرتی۔ کیا مطلب؟ ڈاکٹر ایک بار پھر چلایا۔ میں نے کہا بیگم نے آپکو نہیں بتایا کہ آپ کی ناک سے بال بائزٹک رہے ہیں؟ اتنا کہنا تھا کہ اس نے کہا سیکرٹی۔ اسے لے جاؤ۔ اس کے بعد ڈاکٹر روٹین کے مطابق ملتا تورہا لیکن کبھی اشتغال دینے کی کوشش نہ کی۔ میرے بعد وہ میرے دوسرا سے ساتھیوں کو بھی ملا لیکن میرے ساتھ ہونے والے تجربے کی وجہ سے اس نے ان کی کھوپڑی کا معائنہ کرنے سے اجتناب کیا۔ ہمارے ونگ پر ایک سکھ سیکورٹی افسر بھی تھا۔ ہنسی مذاق سکھ سرداروں کے مزاج کا

حصہ ہے۔ اس نے دیکھتے ہی مجھے کہا راجہ جی جے خود مختار کروانا جے تے فیئر ڈٹ کے رہنا پے گا۔ سینئر افسر آریش تھا جس نے کہا آپ کا سفر لمبا ہے۔ اپنا خیال رکھنا۔

ساعت کے دو ماہ بعد سترہ مئی 1985 کو سورج طلوع ہونے سے پہلے ہی ہم تینوں کو تین مختلف ڈسپرسل جیلوں میں منتقل کر دیا گیا۔ مجھے انگلینڈ کے آخری کونے بھیج دیا گیا تاکہ مجھ سے کوئی مل نہ سکے لیکن جن کو احساس تھا وہ وہاں بھی پہنچ جایا کرتے تھے۔ ۲۲ سالوں کے دوران ملاقاتیوں کی لست بہت طویل ہے اس لیے میں نام نہیں لکھتا تاکہ کوئی نام رہ جانے سے کسی کی دل آزاری نہ ہو لیکن میرے اکثر ملاقاتی ایسے تھے جن کو میں گرفتاری سے قبل نہیں جانتا تھا۔ وہ صرف انسانیت، مسلمانیت اور کشمیریت کی بنیاد پر مجھ سے اس طویل قید کے دوران مسلسل ملتے رہے جنکا میں ہمیشہ مشکور رہوں گا۔ ملاقاتیوں کی اکثریت رضا کارانہ طور پر میری مالی مدد بھی کرتی رہی۔ ڈسپرسل جیلوں میں قیدیوں کو قید کی مدت بتا کر مرحلہ وار رہائی کی تیاری کروائی جاتی ہے لیکن ہمیں تو آخری دن تک رہائی کا علم نہ تھا۔ پھر بھی ہم نے حالات کا مقابلہ کیا۔ میں نے اپنی جیل کی زندگی کے تین مشاغل طے کیے۔ تعلیم، ورزش اور عبادت۔ تعلیم کی اجازت بڑی دیر بعد ملی اور وہ بھی جیسا کہ پہلے زکر ہوا، ہائی کورٹ میں رٹ کے نتیجے میں جبکہ ورزش اور عبادت میرے اپنے اختیار میں تھے۔ اپنا کھانا پکانے کا بھی کبھی کبھار موقع مل جایا کرتا تھا۔ کیتھیگری اے کی وجہ سے ملاقاتوں کا رہائی تک مسئلہ ہی رہا۔ ہوم آفس سے ملاقاتیں منظور کرانے کا ایک طویل اور پیچیدہ طریقہ کا رتھا۔ ملاقاتی کو ہمیں خط لکھنا پڑتا تھا۔ ہم ایک فارم پر کرتے جسے جیل مقامی پولیس کو بھیج کر ملاقاتی کا پس منظر معلوم کیا جاتا۔ پولیس انکو اسی کے بعد فالل ہوم غنڈر کے پاس جاتی جو تمی فیصلہ کر کے جیل گورنر کو بھیجنتا۔ اس کے بعد ملاقاتی کا روڑ جاری کرو اکر ملاقاتی کو ہم بھیج سکتے تھے۔ ملاقاتی جب آتے تو یہ قسمت پر محصر تھا کہ اس دن ڈیوٹی پر کون ہے۔ کچھ افسران نرم رو یہ رکھتے تھے اور کچھ سخت۔ بہت کم ملاقاتیں آرام دہ ماحول میں ہوتی تھیں لیکن ہماری کوشش ہوتی تھی کہ جو جیل میں ملنے آئے اسے اندر کی تابع کہانیاں بتا کر پریشان نہ کریں۔ میں اکثر یہ تاثر دینے کی کوشش کرتا تکہ سب ٹھیک ہے کیونکہ جیل کے اندر کے حالات پر قابو پانے کے لیے ہر قیدی کو خود حکمت عملی طے کرنی ہوتی ہے۔ صبر، حکمت اور استقامت ہر جگہ کام کرتے ہیں۔

سیاسی قیدیوں کا تعاون:

آر لینڈ بھی انگریزوں نے سازش کر کے 1920 میں جنوبی اور شمالی آر لینڈ میں تقسیم کر دیا تھا۔ آر شوں کی تحریک زوروں پر تھی کہ اس وقت کے وزیر داخلہ و سن چرچل جودوسری جنگ عظیم میں اتفاق رائے سے جنگی وزیر اعظم بنائے گئے تھے نے آر شوں کو جنوبی حصے میں حکومت بنانے کی تجویز دی۔ مقصد آر لینڈ کی تحریک آزادی کی قوت کو توڑنا تھا۔ آر شوں وقت طور خوش ہوئے مگر انگریز سیاسی کھیل کھیل رہے تھے۔ انہوں نے تقسیم کا ذکر کیے بنا آر لینڈ کو تقسیم کر دیا۔ انہوں نے کہا تھا کہ آر لینڈ میں کیتوںکو اور پروٹستنٹ عیسائیوں کے درمیان حالات نارمل ہوتے ہی برش فوج کو واپس بلا لیا جائے گا تب تک آر شوں جنوب میں اپنی حکومت مستحکم کریں مگر یہ محض ایک سیاسی چال تھی۔ برطانیہ آج ایک سو ایک سال گزر جانے کے بعد بھی حالات کی خرابی کے بہانے جنوبی آر لینڈ میں موجود ہے جس کے خلاف آر شوں نے جدوجہد جاری رکھی ہوئی ہے۔ اسی جدوجہد کے دوران مشہور تنظیم آئی آر اے نے ہندوستان کے آخری وائراء لارڈ ماونٹ بیٹن کو کشتی میں سیر کرتے وقت 1979 میں ایک بم سے کشتی اڑا کر قتل کر دیا تھا۔ جموں کشمیر کی تقسیم میں بھی بیٹن نے گھناؤنا کردار ادا کیا۔ ماونٹ بیٹن نے آر شوں کی زندگی اجیرن بنا رکھی تھی تو انہوں نے اس کی زندگی کا خاتمه کر دیا۔ آئی آر اے نے وزیر اعظم مار گریٹ تھپر اور اس کے جانشین جان میجر اور وزیر دفاع نام کنگ کو بھی الگ الگ پلان کے تحت قتل کرنے کی کوشش کی مگر تینوں نئے نئے۔ جیل میں عرب اور سکھ سیاسی قیدی بھی تھے۔ عرب قیدیوں کو ان کی حکومتوں کی بھروسہ مدد حاصل تھی۔ تحریک خالصتان بھی سکھ قیدیوں کی پشت پر تھی۔ لندن میں لکنی نسل کی ایک انگریز کمیونٹی برطانیہ میں بڑی بہادر تصور کی جاتی ہے۔ وہ صرف اس سوق کے تحت میری پشت پر تھے کہ میں تو می کا ز کے لیے جیل میں ہوں۔ حکام مجھے خاموش رہنے کے لیے جب ہراساں کرنے کی کوشش کرتے تو یہ لکنی گروپ میری مدد کو پہنچ جاتا۔ سکھوں اور عربوں کو بھی مجھ سے بہت ہمدردی تھی لیکن مقامی ہونے کے باعث آر شوں نے نسبت زیادہ بااثر تھے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ حکومت نے میری وکلاء کی سہولت ختم کر دی ہے تو انہوں نے روجر نامی ایک تیس سالہ نوجوان وکیل کو میرے ساتھ ملاقات کے لیے بلایا۔ وہ تھا تو انگریز مگر آر شوں کے ساتھ ہونے والی نافاضی کے خلاف تھا۔ برطانیہ میں بے شمار ایسے برل اور انصاف پسند انگریز موجود

ہیں جو اپنی حکومت کی غیر منصفانہ اور توسعی پسندانہ پالیسیوں کے خلاف ہیں۔ عراق اور افغانستان پر امریکی ہملاوں میں برطانیہ کی حمایت کے خلاف مظاہروں میں بھی ایسے انصاف پسند انگریزوں کا کردار دیکھا جا چکا ہے۔ مسٹر رو جر ایڈ ووکیٹ کو میں نے بتایا کہ کسی وجہ سے میری تظمیم میری مدد نہیں کر پا رہی۔ میری فیصلی بھی برطانیہ میں نہیں ہے جس کی وجہ سے میرے پاس اس کی فیصلہ کا کوئی انتظام نہیں لیکن انسانی بنیادوں پر اگر وہ میرے کیس کی پیری کرے تو اگر بھی میں اس کی فیصلہ دینے کی پوزیشن میں ہو تو ضرور دونگا۔ اس عظیم وکیل نے کہا فیصلہ نہیں اپ کی رہائی پہلی ترجیح ہے۔

لارڈ چیف جسٹس سے خفیہ خط و کتابت

مسٹر رو جر ایڈ ووکیٹ کو میں نے کہا کہ میں لارڈ چیف جسٹس کو ذاتی خط لکھنا چاہتا ہوں۔ اس نے اسے اچھا خیال قرار دے کر میرا خط لے لیا۔ لارڈ چیف جسٹس کے نام مکتب میں میں نے صرف اتنا لکھا کہ اگر عدالیہ آزاد ہے تو ٹرائل بج نے میرا کیس ہوم منٹر کے حوالے کیوں کیا؟ ہوم منٹر کو میں نے پوچھا کہ میں کب بڑی ہوں گا تو اس نے انتہائی بے رخی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ میری سزا کا اعلان کرنا یانہ کرنا اس کی صوابید پر ہے تو جناب چیف جسٹس صاحب اگر ساعت عدالت کرتی ہے تو سزا ہوم منٹر کیسے دے سکتا ہے؟ ان حالات میں برطانوی عدالیہ کی آزادی کا کیا مطلب ہے؟ رو جر میرا یہ مختصر خط پڑھ کر بہت خوش ہوا اور کہا کہ اس میں اضافے کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس عظیم لارڈ چیف جسٹس نے ایک ہفتے بعد ہی مجھے جواب میں ایک ہزار الفاظوں پر مبنی کیس سسری لکھنے کی بدایت کرتے ہوئے کہا اس سسری میں اگر کوئی قانونی جان ہوئی تو وہ مجھے قانونی جنگ کے لیے غیر محدود لیگل ایڈ لوائیں گے جس کے نتیجے میں مجھے مرضی کا وکیل کرنے کا انتیار مل جائے گا۔ میں نے اپنے کیس کی تفصیلات لکھتے ہوئے مذکورہ سوالات میں یہ اضافہ کیا کہ کھلی عدالت کو خفیہ سزا دینے کا کوئی اختیار نہیں اور نہ ہی کیس ہوم منٹر کے حوالے کرنا چاہیے تھا۔ ساعت کے بعد سزا کی مدت جانا ہر قیدی کا حق ہوتا ہے جس سے مجھے محروم کیا گیا۔ لارڈ چیف جسٹس نے مجھے ذاتی خط و کتابت کو بند کر کے تخت ضابط ہائی کورٹ میں رٹ دائر کرنے کا مشورہ دیا۔ جیل انتظامیہ حیران تھی کہ لارڈ چیف جسٹس کے ساتھ براہ راست میرا باطحہ کیسے ہو گیا۔ برحال مسٹر رو جر ایڈ ووکیٹ کو میں نے رٹ دائر کرنے کا مشورہ دیا جو منظور ہو گئی۔ اتنے میں میری والدہ آگھیں تو میں نے فریباںک لینڈ جیل ڈرہم سے لانگ لارٹن جیل

متنقلی کی درخواست دی جہاں ملاقاتوں کے لیے والدہ صاحبہ کو کم سفر کرنا پڑتا تھا۔ جوں ہی میں نے اس جیل سے جنوبی انگلینڈ کی کسی جیل میں منتقلی کا درخواست دی تو جیل انتظامیہ نے میرے ساتھ انہتائی نرم رویہ اپنالیا۔ وہ ہر صورت میں مجھے فرینک لینڈ جیل میں رکھنا چاہتے تھے۔ اس کی ایک وجہ مجھے کشمیری کمیونٹی سے دور رکھنا تھا۔ دوسرا میں جس کمیگری میں تھا اسی کمیگری کسی قیدی کے ساتھ میرا تباہ لہونا تھا۔ جیل انتظامیہ جب دیکھتی ہے کہ کوئی قیدی ان کے لیے مسائل پیدا نہیں کرتا تو پھر ان کی کوشش ہوتی ہے کہ اس کا تباہ لہونا کیا جائے ورنہ کیا معلوم کر نیا آنے والا کیسا ہو گا۔ میں نے جب انتظامیہ کی بات نہ سنی تو انہوں نے کراچی سے تعلق رکھنے والے ایک پارسی ڈاکٹر کی بیگم جیروہی کو میرے پاس مجھے قائل کرنے کے لیے بھیجا جس نے کہا اس جیل میں آپ کی زندگی آسان رہے گی۔ پھر ایک انگریز طالبہ بھی آئی جس نے کہا اگر میں اس جیل کے قریب ہی رہتی ہوں اور اگر تم یہاں ٹھہر جاؤ تو میں ملتی رہوں گی لیکن میری والدہ کی صحت میرے لیے سب سے اہم تھی۔

لیلائے آزادی کے دو خالصتانی پروانے

بالآخر مجھے جیل گورنمنٹ ملنے آیا اور کہا آئی ایم سوری وی آر گومنگ ٹولوز یو۔ مجھے درخواست کی منظوری کا اشارہ تومل گیا لیکن مجھے معلوم تھا کہ متنقلی خفیہ ہو گی۔ چند دن بعد جب سب قیدی سوئے ہوئے تھے تو سیکورٹی نے صحیح پانچ بجے آ کر سب سے پہلے مجھے ہٹھلوڑی لگائی۔ ہٹھلوڑی جہاں تکلیف دہ تھی وہاں ایک فائدہ بھی تھا کہ میرا سارا سامان سیکورٹی کو اٹھانا پڑتا تھا اور میں مزے سے ان کے ساتھ گاڑی پر ہوتا۔ میں نے لانگ لارٹن جیل کو ترجیح دے رکھی تھی لیکن سیکورٹی وین گاڑڑی جیل لیسٹر جا کر کریکی جہاں سے کچھ فاصلے پر مہاترے گولی کا ناشانہ بناتھا۔ اسی جیل میں میرے دوسرا دو ساتھی ریاض اور صدیق تھے۔ ہربڑی جیل میں چھوٹنگ ہوتے ہیں۔ جیل کے گیٹ سے جب سیکورٹی وین اندر داخل ہوئی جہاں سے اب سیکورٹی مجھے پیدل کسی ونگ میں لے جا رہی تھی کہ اچانک مختلف سمت سے ایک مرد اور خاتون آئے۔ مرد نے میری چال پر نظر ڈالی۔ قریب آ کر مسکرا یا اور کہا یو آ رفت۔ یہ میرا میڈیکل میسٹ تھا۔ آگے بڑھا تو ونگ کی دوسری منزل سے ایک خالصتانی نے نعرہ لگایا: واه اے گورو جی کی فتح، واه گورو جی کی خالصہ۔ میں نے نیچے سے آواز لگائی، سردار جی نسی جیل وچ کی لین آئے ہو؟ سردار جی بولے کہ خالصتان لینے آئے ہاں۔ پھر سردار نے مزید دونرے لگائے اور پوچھا

میں کس لیے جیل میں ہوں؟ میں نے کہا اسی کشیر لینے آئے ہاں۔ چونکہ سردار کو معلوم تھا کہ ریاض اور صدقیق اسی جیل میں تھے اس لیے وہ سمجھ گیا کہ تیسرا کشیری کون ہے۔ اس نے کہاتی راجہ صاحب او۔ میرے اثبات پر اس نے کشیر کے حق میں بھی نعرے لگاتے ہوئے کہا پھر تی میرے ول آجائے۔ میں نے کہا سردار جی اے تے ہوں حکماں تے مخصرے۔ یہ سندر تھا اور دوسرے ونگ سے اس کے ساتھی منجیت کی آواز آئی۔ منجیت اور سندر کو حج نے را کے ایجنت کو برمنگھم میں قتل کرنے کی بیس بیس سال سزا دی تھی۔ جب حج سکھ کمیونٹی کو مطمئن کرنے کے لیے سزا کی تمہید باندھنے لگا تو منجیت نے حج کو کہا: لمیاں تقریر اس نے کہ جتنی دینی ای دے دے۔ حج نے مترجم سے پوچھا یہ کیا کہہ رہا ہے تو ترجمہ سن کر حج نے کہا میں نے تمہیں بھی تمہارے ساتھی کی طرح میں سال دینی تھی لیکن اب تمہیں تیس سال دے رہا ہوں۔ منجیت نے عدالت میں ڈنس کرنا شروع کر دیا۔

برمنگھم میں ٹڈل ووڈ نام کی ایک لیگل فرم تھی جس کا سربراہ ایک انگریز وکیل مارک فلپس تھا۔ اس نے سکاٹ لینڈ میں جنم لینے والی پاکستان نژاد ایک وکیل سمعیہ کو مجھ سے ملاقات کے لیے بھیجا۔ یہ میری خوش نصیبی تھی کہ وزیر داخلہ کا خفیہ فیصلہ منظر عام پر آنے کے بعد مجھے جو بھی وکیل متاثر سے میرے ساتھ ہذا تی ہمدردی ہو جاتی تھی مساوائے ریمانڈ کے دوران ان وکلاء کے جو پولیس نے مسلط کیے تھے یا جارج جونس جو امان اللہ خان نے بھیجا تھا۔ سمعیہ کی عمر بھی صرف تیس برس تھی۔ خوبصورتی کے ساتھ ساتھ قدرت نے اسے سیرت بھی عطا کی ہوئی تھی۔ وہ امریکہ چل گئی تھی جہاں اس نے اپنی ذاتی لیگل فرم قائم کی۔ ہماری ملاقات 1994 میں ہوئی تھی۔ ایک سال بعد وہ امریکہ نقل مکانی کر گئی تھی مگر آج بھی اسکا میرے ساتھ رابطہ ہے۔ ایسے ہی تعلق کو بے اوث انسانی رشتہ کہا جا سکتا ہے جس کی مٹھاں میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اضافہ ہی ہوتا رہا۔ حال ہی میں لا ہو رجاتے ہوئے سمعیہ کے آبائی شہر گجرات کی تصویر بنانے کے لئے اپ کی توجہ بہت جذباتی ہو گئی۔ جدا مجد ہر ایک کے لیے اہمیت رکھتا ہے۔ مجھے جیل میں کیل نامی ایک انگریز پرویشن افسر ملی جنکا دعوی تھا کہ وہ بہت چھوٹی تھی جب اس کے والدین شمالی بھارت میں فوت ہو گئے تھے مگر اسے آج تک کسی نے اس کی جائے پیدائش کے اصل حقائق نہیں بتائے۔ بتیں کرتے کرتے وہ روپڑی۔ بعض اوقات ہمارے سامنے ہنسنے مسکراتے لوگ اندر سے بہت دکھی ہوتے ہیں لیکن دنیا کو علم نہیں ہوتا۔

فرقِ مہم کا قیام

برمنگھم شہر میں کشمیری کمیونٹی کے رہنماؤں کا ایک اجلاس ہوا جس میں مارک فلپس ایڈ ووکیٹ کو بھی بلا یا گیا۔ مارک نے بھی سیاسی مہم کی ضرورت پر زور دیا۔ ان دونوں میرے ساتھ مستقل رابطہ حاجی آفتاب احمد انصاری صاحب، محمد غالب صاحب اور ڈاکٹر مقصود احمد غوری صاحب کا تھا۔ ڈاکٹر مقصود لیبیا میں ایک اہم پوسٹ پر تھے۔ چھ ہفتے بعد دونوں ہفتون کے لیے لیبیائی حکومت کے خرچ پر واپس آیا کرتے تھے۔ وہ ہماری سیاسی مہم چلانے کی پوزیشن میں نہ تھے لیکن وہ جب بھی واپس گھر انگلینڈ آتے تو مجھے ملا کرتے تھے۔ حاجی آفتاب صاحب بھی انتہائی ہمدرد ہونے کے باوجود کشمیری سیاست سے نالاں تھے۔ محمد غالب صاحب سیاسی و مذہبی طور پر کافی متحرک تھے۔ لبریشن فرنٹ کی اس وقت کی قیادت اس خوف میں بنتا تھی کہ اگر ہمارا کیس دوبارہ کھل گیا تو شاید نہ جانے کون کون سے راز افشا ہوں گے۔ یہ ان کی غیر مطلقی سوچ تھی کیونکہ دور ان سماعت تو ہم سب نے جماعت کا دفاع کیا تھا۔ ان کی کوشش تھی کہ ہماری فائل بند ہی رہے۔ اس وقت جو بھی کوئی ہمدرد آزاد کشمیر اور پاکستان کی حکومتوں کو ہمارا کیس اٹھانے کی تجویز دیتا تو وہ یہی کہتے کہ جی تقل تو آ خر ہوا ہے۔ نہم کیا کریں۔ پاکستان کے ہائی کمشنرو اجدائسن نے تو ایک بار بریڈ فورڈ میں بنیظیر بھٹو کے جلسے میں عظمت خان کے سوال کے جواب میں یہاں تک کہہ دیا کہ پاکستان تقل کی جمایت نہیں کرتا جس پر ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ اصل وجہ ان کی اپنی بزدلی اول پس پر دہ رخود مختار تحریک کی مخالفت تھی لیکن لا رو چیف جسٹس کا میرے نام خط اور ان کی ہدایت پر ہائی کورٹ میں رٹ نے ہمارے خلاف تمام منفی پرو پکنڈوں کو مات دے دی۔ اس کامیابی کو برطانیہ کے دوسرے بڑے مشہور قومی اخبار گارڈین نے اجاگر کر کے ہمارے موقف کو اور تقویت دی۔ گارڈین نے میرا ایک مکتوب بعنوان برطانیہ جہاں سماعت جائز کرتے ہیں اور سزا اسیا ستدان دیتے ہیں شائع ہوا۔ اس خط نے تمہلمکہ مچا دیا۔ اپنے تو اپنے تھےاب بے گانے

بھی میرے حق میں بولنا شروع ہو گے۔ ارکین پارلیمنٹ، کنسلرز اور انسانی حقوق کے ادارے میرے حق میں سامنے آ گے۔ برطانیہ کی سابق وزیر اعظم مارگریٹ تھپر نے اسلام آباد دورے کے دوران جمہوریت پر لپکھر دیا تو میں نے گارڈین کو ایک اور خط لکھا ڈالا جس کا عنوان تھا پہلے اپنے گھر کی خبر لو۔ آپکی حکومت عدلیہ کو بائی پاس کر کے ہم جیسے قیدیوں کو سیاسی سزا میں دیتی ہے۔ مارگریٹ تھپر کب خاموش رہنے والی تھی۔ اس نے میرے خط کے جواب میں پریس میں لکھا: "If you cant"

"do time, dont do crime!" اب سیاسی میدان خوب گرم ہو چکا تھا۔ سابق برطانوی وزیر اعظم مارگریٹ تھپر کے حق اور میرے خلاف نہد ان سے بھارت کے ڈپٹی ہائی کمشنرنے پریس کو خط لکھا کہ میں خوش نصیب ہوں جو برطانیہ میں قید ہوں۔ اگر بھارت، پاکستان یا بھگھہ دیش میں ہوتا تو اب تک پھانسی پر لکا دیا گیا ہوتا۔ اس نے کہا کہ میں نے برطانیہ کا قانون توڑا ہے۔ اب چپ کر کے سزا کاٹوں۔ میں نے جواب میں کہا کہ مہاتما گاندی اور نہر و کوہجی برطانیہ کی عدالتون نے قانون شکنی کی جرم میں سزا میں دی تھیں۔ اس بارے کیا خیال ہے؟ اسکے بعد اس نے کبھی میرے خلاف زہر اگنے کی کوشش نہ کی۔ اس گرامگری کے دوران میں کشمیری رہنماؤں کا اجلاس ہوا۔ محمد یونس تریابی تین سال آزاد کشمیر میں قیام کے بعد واپس برطانیہ پہنچ چکے تھے۔ یہ میرے لیے بہت اچھا تھا کیونکہ یونس تریابی ایک باعمل اور میرے بہت ہی ہمدردادی تھے۔ تریابی صاحب حاجی آفتاب احمد النصاری صاحب اور محمد غالب صاحب کے ہمراہ مجھے ملنے گے۔ اس تاریخی ملاقات پر سیاسی مہم چلانے کا فیصلہ کر لیا گیا جسکو لارڈ چیف جسٹس کی پہايت پر ہائی کورٹ میں رٹ نے حوصلہ بخشنا تھا۔ اجلاس میں یوں تو متعدد کشمیری رہنماؤں شامل ہوئے۔ عمر آ خرد میں موجود رہے ان میں مذکورہ تین محکین کے علاوہ عظمت علی خان، اسلم لون، مخصوص انصاری، ناظم بھٹی، پروفیسر عبدالحسن عاصم، مرزا محمد معروف، اشتیاق احمد چودھری، چودھری محمد فیق، منیر مغل اور راجہ محمد ایوب تھے جبکہ ارکین پارلیمنٹ میں ڈاکٹر برائی ایڈن ایم پی، میکس میڈن ایم پی، روجر گاؤسف ایم پی، جیری سٹکلف ایم پی، فیونا میگنیگرٹ ایم پی، خالد محمود ایم پی، لارڈ ایوب ری اور لارڈ نذیر احمد اور برطانیہ میں پہلے کشمیری لارڈ کنسلر لارڈ محمد عجیب شامل تھے۔ فراق کو متعدد دوسرے کو نسلرز اور کیوٹی رہنماؤں کی حمایت حاصل تھی جنکے نام کی فہرست میرے پاس نہیں ہے۔ شمس الرحمن ایک ادبی ادمی ہیں جنہوں نے مہم کا نام فراق یعنی فری ریاض ایڈن قیوم تجویز کیا۔ فراق نے سیاسی اڑان لی۔ جو ق در جو ق لوگ

شامل ہونا شروع ہو گے۔ معروف مرزا، اشتیاق احمد، چودھری محمد رفیق اور منیر مغل تب مہم میں شامل ہوئے جب انہوں نے شیفیلڈ سے پروفیسر عاصم صاحب کی قیادت میں مجھ سے ملاقات کی۔ بولٹن سے کونسلر ایوب کی قیادت میں فراق کی شاخ قائم ہوئی جو ۲۰۲۳ میں میر منتخب ہو گئے جبکہ شیفیلڈ میں کونسلر معروف مرزا قیادت کر رہے تھے۔ پہلے مرکزی کوارڈینیٹ پروفیسر عظمت علی خان تھے، دوسرے اسلم لون اور آخری یونس تربیابی۔ فراق کے خلاف بھی بہت سازشیں ہوئیں مگر دم تو رکھیں۔ اراکین پارلیمنٹ کی قیادت ڈاکٹر برائن ایڈن، لارڈ ایوب ری، میکس میڈن اور جیری سٹکلف کر رہے تھے۔ لارڈ نذر احمد فراق میں باقاعدہ شامل تونہ تھے لیکن حمایت بھر پور تھی۔ پروفیسر راجہ ظفر خان بھی ذاتی طور پر رابطے میں رہے لیکن مہاترے قائل کی جماعت سے انکو اری کی میری درخواست جس کی پیش میں امام اللہ خان آتے تھے کی وجہ سے وہ بھی لبریشن فرنٹ کو بطور تنظیم کوئی کردار ادا کرنے کے لیے قائل نہ کر سکے لیکن پھر بھی وہ گائے بگائے مجھ ملتے رہے۔

پریس کارکردار

یوں تو بے شمار صحافی مجھے ملتے رہے لیکن تسلسل کے ساتھ جن چار صحافیوں نے کمیونٹی کو متحرك کر کے کیس کی سمت متعین کی اس میں علی کیانی، محمد سرور، ظہور نیازی اور شاہد سید اللہ تھے۔ علی کیانی متاز راٹھور کی حکومت میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز رہنے سے پہلے ڈلن اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ ان کا تعلق چناری سے تھا۔ متاز راٹھور کی حکومت ختم ہونے کے بعد وہ جنگ لندن میں بطور چیف سٹاف رپورٹر کام کرتے رہے جبکہ ظہور نیازی اور شاہد سید اللہ بالترتیب جنگ اخبار کی اردو اور انگلش سیکیشن کے ایڈیٹر تھے۔ کراچی سے تعلق رکھنے والت محمد سرور دی نیشن کے ایڈیٹر تھے۔ شروع میں بھارتی صحافی تو مخالفت کرتے رہے لیکن جب برطانیہ کا پریس بھی حکومت کی طرف سے سیاسی سزاوں کی مخالفت کرنے لگا تو بھارتی میڈیا نے بھی ہماری رہائی کی حمایت کر دی۔ برطانیہ کے گارڈین اخبار نے میری سزا کے وقت وی کے نشان پر قوم کو بہادرانہ سلام کے عنوان سے خبر لائی تھی جبکہ تین صحافیوں پر مشتمل ایک ٹیم بھی ترتیب دی گئی تھی جس نے اس سوال پر تحقیق کی کہ آیا پرپ کے ماحول میں رہنے والے کشمیری نوجوانوں نے یہ مشکل راستے کیوں اختیار کیا۔ رپورٹ کا لب ولباب بہت ہی مثبت تھا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ جموں کشمیر کے ساتھ ناصلانی نے ان نوجوانوں کو اس راستے پر ڈالا ہے۔

جیل کے شب و روز

ایک ہفتہ پولیس سٹیشن میں رکھنے کے بعد ریاض، صدیق اور مجھے بمنگھم کی بدنام زمانہ تدبیحی جیل و نسن گرین منتقل کیا گیا۔ گیٹ سے جوں ہی سیکورٹی وین اندر داخل ہوئی، ہماری ہتھکڑیاں کھول دی گئیں۔ حکم ملا کہ کپڑے اتنا رو۔ وجہ سمجھنیں آ رہی تھی کہ اتنے میں داروغوں نے جیل کا پونیفارم ہمارے سامنے پھینکا۔ میں نے کہا کپڑے بدلنے کے لیے پرائیویسی چاہیے تو سیکورٹی نے بڑا تھا ہوئے کہا یہاں کوئی پرائیویسی نہیں۔ کپڑے بدلو۔ وقت صائم نہ کرو۔ لانک تک دیم نہ کشیدم، ہماری حالت عجیب تھی۔ کپڑے بدل کر ہمیں کیٹھگڈی اے یونٹ ڈی میں لے جایا گیا جو ہائی رسک قیدیوں کے لیے خصوص تھا۔ ہم تینوں کو الگ الگ سیلووں میں بند کیا گیا۔ ریاض کا کھانا گھر سے والدین لانے لگے۔ چند دن انہوں نے مجھے بھی دیا مگر پھر سیکورٹی نے یہ کہہ کر میرا کھانا بند کر دیا کہ تمہارا کھانا تمہارے اپنے والدین لے کر آئیں۔ میں نے کہا والدین سال قبل فوت ہو گئے تھے اور والدہ کشیر میں ہیں۔ انہوں نے کہا یہ ہمارا مستملہ نہیں ہے۔ وقت طور پر ہم خاموش ہو گئے لیکن رات کو بستر کی چادر کے کونے میں مرغی کی چوڑیاں اور کباب باندھ کر ریاض اپنے پڑوی قیدی کو گھر کی سے دیتا اور دس سیلووں سے ہوتا ہوا کوئی پندرہ بیس منٹ بعد کھانا مجھ تک پہنچ آتا۔

ہمیں چوبیس گھنٹوں میں سے صرف ایک گھنٹہ چہل قدمی کے لیے دیا جاتا اور وہ بھی مجھے اکیلے تاکہ ہم تینوں ایک متفقہ عدالتی بیان کا تعین نہ کر سکیں۔ ساعت شروع ہونے سے پہلے امان اللہ خان نے صدیق بھٹی کو اقبال جم پر قابل کر لیا جس کی وجہ سے صرف ریاض اور میری ساعت ہوئی۔ ساعت ٹھیک تیرہ ماہ بعد شروع ہوئی۔ اس دوران ہم سیل کے اندر ہی رہتے چہاں اخبار بھی اکثر روک دیے جاتے اور کتابوں کے لیے بڑی لا بیری میں بھی جانے کی اجازت نہ تھی۔ گورنر کا کہنا تھا کہ ہم قانون اور میڈیا کی کوئی کتاب نہیں پڑھ سکتے۔ اس نے کہا تم کتاب کا عنوان لکھ کر دو۔ اگر ہم عنوان منظور کر سکتے تو خود لا بیری سے لے آئیں گے یا پھر ونگ لیب سے محدود کتابوں میں سے کوئی ایک کتاب ایک ہفتہ کے لیے رکھ سکتے ہو۔ لیب سے میں نے جان بوجھ کروں کے سابق صدر جوزف سٹالن کی کتاب اٹھا لی۔ مجھے معلوم تھا وہ پسند نہیں کریں گے اور جب اعتراض کریں گے تو میں کیا جواب دوں گا۔ گورنر نے کہا۔۔ او۔ یو۔۔ لانک سٹالن؟ میں نے کہا تم بڑی لیب میں جانے نہیں دیتے تو جو

ہے میں نے وہی پڑھنی ہے۔ چند دنوں بعد انہوں نے لیب میں مزید کتابتیں لا سکیں اور ہم نے مطالبہ کیا کہ کچھ اسلامی کتابتیں بھی لا سکیں۔ اس طرح سیرت بنی کی ایک کتاب بعد ریمعہ امام منگوائی گئی۔ سترہ ماہ بعد مجھے ایک دور دراز جیل فریت نکلیا، ریاض کو گھر سے کوئی سوا گھنٹہ کی مسافت پر لیسٹر جیل اور صدیق کو اس سے کچھ دور و یک فیلڈ جیل بھیج دیا گیا۔ فریونک لینڈ میں مجھے ایک ہفتہ جائزہ ونگ میں رکھا گیا۔ وہاں شعبہ نفیات، پروپیش سروس اور ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ کے نمائندے روٹین کے طور پر قیدیوں سے مل کر جائزہ لیتے ہیں کہ ان کو کہاں ایڈ جسٹ کیا جائے۔ پروپیش افسر ایک اچھی خاتون تھی لیکن جب میں نے ایجوکیشن افسر سے قانون کی ڈگری بارے معلومات مانگی تو اس نے کہا چلنے سے پہلے دوڑنے کی کوشش نہ کرو۔ اس طرح جس سے مجھے سب سے بہتر رہیے کی توقع تھی وہ سب سے زیادہ بد اخلاق نکلی۔

تعلیم کے لیے ہائی کورٹ میں رٹ:

ایجوکیشن افسر کے ساتھ میری نکر بال آخر ہمیں ہائی کورٹ میں لے گئی۔ میں نے ہائی کورٹ رٹ میں کہا کہ جیل مینیو کے مطابق ہر قیدی کو پرائیویٹ سٹڈی کا حق ہے مگر میرے ساتھ تعصباً برتا جا رہا ہے۔ ہائی کورٹ نے جوں ہی میری رٹ سماعت کے لیے منظور کی تو ایجوکیشن انچارج نے مجھے بلا کر کہا کہ اگر میں رٹ واپس لے لوں تو اگلے تعلیمی سال میں میرا نام فہرست کے ٹاپ پر ہو گا۔ ہماری صلح ہو گئی اور اس طرح میں نے نفیات کا ڈگری کورس شروع کر دیا لیکن اس خاتون ایجوکیشن افسر این موریل کے ساتھ میرا بائیکاٹ جاری رہا۔

شام کی کمپیوٹر کلاسیں ہوا کرتی تھیں جہاں کمپیوٹر انٹرکٹر بھی ایک خاتون مس گڈا یئر تھی اور واقعی گذھتی۔ میں اس کی کلاس میں گیا تو اس نے سوچا کشمیر کے پہاڑوں میں کہاں کمپیوٹر رز ہوئے ہوں گے۔ میں نے کمپیوٹر کا باقاعدہ کورس کر رکھا تھا۔ وہ مجھے کی ٹپنگ سکھانے لگی تو میں نے کہا آپ بولتی جائیں میں ٹائپ کرتا جاؤں گا۔ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور پھر بولی: ٹھیک ہے مجھے چلنج قول ہے۔ میں جب فل پیڈ میں ساری انگلیوں سے ٹائپ کرنے لگا تو اس نے خوشنی کا اظہار کرتے ہوئے مجھے ایڈ و انس کورس میں ڈال کر دوسراے قیدیوں کی مدد کے لیے رکھ لیا۔ مس گڈا یئر کمپیوٹر سسٹم تو مجھے سے زیادہ جانتی تھی لیکن اس کی ٹائپنگ میری سپیڈ جتنی تھی۔ میری اس مہارت کی خبر

لیبر بورڈ کو ملی تو اس نے مجھے مینیوں دو رکی مردم شماری کا ریکارڈ کمپیوٹر آئز کرنے پر لگا دیا۔ انگریز بڑے عقائد ہیں۔ جیل انتظامیہ نے سوچا اس ادمی کا ہمارے ساتھ تو کوئی جھگڑا ہے نہیں۔ اس کی تکمیر وزیر داخلہ سے ہے۔ ہمیں اس کے ساتھ بگاڑنے کے بجائے اس کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ رات کو میرے دروازے پر لات مار کر میری نیند میں خلل ڈالنے کا سلسلہ رک گیا۔ وہ مجھے سے کام لینے لگے اور میں اسی میں سے اپنے مقصد کا کام بھی نکال لیتا اور وہ تھا کمپیوٹر پر اپنا کیس تیار کرنا اور اخبارات کے لیے مضمایں لکھنا۔ اس طرح میں ہارڈ لیبر سے بھی بچ گیا۔ ایجوکیشن افسرو شروع میں میرے خلاف ہو گئی تھی وہ ایک دن ناقابل تلقین طور پر میرے پاس آئی۔ مجھے دفتر میں لے جا کر کہا آؤ ماضی کو دفن کر کے دوست بن جائیں۔ میں یہ سوچ کر محاط ہو گیا کہ شاید یہ اب کسی اور گیم پر ہے لیکن وہ حقیقت میں ثابت ہو گئی تھی جس کی ایک وجہ لگتی تھی کہ ایجوکیشن کا باقی سطاف میرا ساتھ جب اس کے سامنے دوستانہ انداز میں گھنگو کرتا تو اسے شرمندگی ہوتی۔ میرا ریکارڈ خراب کرنے کے لیے کسی نے میرے سیل میں چرس رکھ دی۔ گورنر کے سامنے مجھے پیش کیا گیا تو یہ ایجوکیشن افسرو رضا کارانہ طور پر میرے حق میں کیریکٹر گوائی کے لیے پہنچ گئی۔ گورنر نے مجھے کہا میں اپنے دفاع میں کیا کہتا ہوں۔ میں نے کہا آپ کئی سالوں سے مجھے دیکھ رہے ہیں اگر آپ کو تلقین ہے کہ میں ڈرگ پوش ہوں تو جو چائے سزادے دیں۔ گورنر نے سیکورٹی کو کہا وہ مجھے باڑے لے جائے اور پانچ منٹ بعد واپس لے آئے۔ واپس آیا تو گورنر نے کہا مسٹر راجہ آپ کے خلاف کیس ڈسیس کیا جاتا ہے۔ نوسال بعد میری والدہ مجھے ملنے کے لیے برطانیہ گئیں تو میں نے درخواست کی کہ مجھے ملینڈ کسی جیل میں منتقل کیا جائے کیونکہ ان کی عمر اور صحت ہر روز طویل سفر کی اجازت نہیں دیتی۔ اس موقع پر اس ایجوکیشن افسر نے مجھے اس جیل سے نہ جانے کے لیے قائل کرنے کی بہت کوشش کی اور کہا کہ میری والدہ کی ملاقاتوں کو آسان بنایا جائے گا لیکن میں نے ارادہ نہ بدلا۔ اصل میں جیل انتظامیہ قیدی کو ایک پروڈکٹ سمجھتی ہے۔ میں کیٹیگری اے تھا اور قوانین کے مطابق جیل کو کیٹیگری اے کی جگہ دوسرا کیٹیگری اے قیدی لینا پڑتا ہے۔ اگر قیدی کی سرگرمیاں ثابت ہوں تو جیل انتظامیہ اس کے تبادلے کا رسک نہیں لیتی۔ انگریزوں کی ایک کہاوت ہے کہ آشنا جن سے بہتر ہے۔

فیر یہک لینڈ جیل سے میں لاگن لارٹن جیل گیا جہاں میں نے ۸ سال گزارے۔ اس جیل کا ایجوکیشن اور سائیکا لو جی سٹاف بہت اچھا تھا۔ جیل کے اندر ہر قیدی کو مائرین نفیسیات اخلاقی تربیت

دیتے ہیں لیکن میرے پاس نفیات کی ڈگری تھی اور میں گائے بگائے سائیکالو جی ڈیپارٹمنٹ سے کتابیں بھی لے لیا کرتا تھا۔ شعبہ نفیات کی انچارج نے مجھے اخلاقی کورس سے استثنایا کا لیٹر دے دیا جبکہ ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ میں سکاٹ لینڈ کے جیک اپٹن اور ایک ایڈمن افسر میڈم سومارشل نے میری بہت مدد کی۔ وہاں میں نے ماسٹر ڈگری کا کورس شروع کیا جس کی کچھ فیض کا انتظام پروفیسر عبدالحسن عاصم اور کچھ ایک ایجوکیشن چرٹی نے دیے جس میں جیک اپٹن نے رہنمائی کی۔ میری ایم اے کی ڈگری مکمل ہو گئی تو لیبر بورڈ نے کہا کہ میں کوئی نواب ہوں جو باقی قیدیوں کی طرح فیکٹری میں کام نہیں کرتا مگر اللہ بھلا کرے میڈیکل افسر لیکس بال کا جس نے لیبر بورڈ کو لکھا کہ فیکٹری میں میری صحبت بگڑ جائے گی۔ جیک اپٹن نے جب دیکھا کہ کچھ لوگ جیل میں میرے خلاف ہو گئے ہیں تو انہوں نے سپیشل بچوں کی تعلیم پر مجھے لگا دیا۔ عراق پر امریکہ نے حملہ کیا تو جیل کے اندر قیدیوں کی بھی آئے روزاڑائیاں ہوئے لگیں جبکہ جیل کے اندر زہنی صحبت کا اشو بھی کھڑا ہو گیا۔ جیل گورنر نے ایک مشارقی اجلاس بلا کر سٹاف۔ انمیٹ ریس ریلیشنس گروپ کا قیام عمل میں لا یا جس کا چیز میں مجھے بنایا گیا۔ اس گروپ کے زیر اہتمام ہم نے میٹنگ ہیلتھ پر ایک فورم لانگ لارٹن اور ایک گارڈی جیل میں کروا یا۔ لانگ لارٹن میں ایک سیشن کی صدارت کے لیے میں نے جموں کشمیر کی انسانی حقوق کی تنظیم کے صدر ڈاکٹر نذیر گیلانی صاحب کو دعوت دی اور دوسرا سیشن کے لیے افریقہ سے تعلق رکھنے والی ایک خاتون کو دی۔ لیبر بورڈ نے جیل میں میرے بڑھتے ہوئے اثر و سوخت سے حسد کرتے ہوئے یا خطرہ سمجھتے ہوئے زور دیا کہ میں بھی باقی قیدیوں کی طرح کام کروں لیکن جیل کے اندر سمجھدار افسران نے ایک بار پھر مجھے بچالیا۔ رہائی کے چند سال بعد کا واقعہ ہے کہ جیک اپٹن نے ایک دفعہ سکاٹ لینڈ میں جمیں اف پیس رہنے والے خالد ابریشم کی ٹیکسی ہارٹ کی۔ میری رہائی کے بعد خالد ابریشم مجھے ملنے آئے تو کہا کہ ایک دن ایک سکاٹ جوڑا میری ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ مرد کو خالد کی شکل سے شبہ ہوا کہ یہ کشمیری ہو گا۔ اس نے خالد سے پوچھا کہاں کے ہو؟ خالد نے کہا کشمیری ہوں۔ جیک اپٹن نے کہا اگر کشمیری ہو تو قیوم راجہ کا نام سننا ہو گا۔ خالد نے کہا صرف سنانہیں میں انہیں جیل میں ملا بھی ہوں۔ ان چند حوالوں کا مطلب یہ ہے کہ جہاں برٹش حکومت نے ہمارے ساتھ سیاسی تعصب برداشت وہاں جیل میں ایسے لوگ بھی ملے جن کا موقف تھا کہ ہم کوئی جرام پیشہ لوگ نہیں ہیں اس لیے ہمارے ساتھ مجرموں جیسا سلوک رو انہیں رکھا لیکن اگر ہم اپنا سیاسی و اخلاقی معیار قائم نہ رکھتے تو یقیناً ان اچھے

لوگوں کا بھی ہمارے ساتھ روایہ اچھا نہ ہوتا۔۔

بلیک مینگ سے بچنے کا طریقہ:

انسان دنیا کے جس کونے میں چلا جائے اس کی زندگی میں جہاں اچھے لوگ آئیں گے وہاں ایسے لوگوں سے بھی واسطہ پڑے گا جو اس کی کمزوریوں کی تلاش میں رہیں گے تاکہ بوقت ضرورت اسے استعمال کیا جاسکے۔ جیل ایسی جگہ ہے جہاں تعاون کرنے والے کم اور تنگ کرنے والے زیادہ ہوتے ہیں۔ فوری جسمانی رُدِّمِ عمل دینے والے قیدیوں کو سیکورٹی آسانی سے کنٹرول کر لیتی ہے کیونکہ قیدی مکمل غیر مسلح اور سیکورٹی پوری طرح مسلح ہوتی ہے۔ اس کی نسبت نفیسیاتی رُدِّمِ عمل کا مظاہرہ کرنے والے قیدیوں سے سیکورٹی خائنِ رہتی ہے۔ ایسے قیدیوں کی ضروریات کا پچھہ لگایا جاتا ہے تاکہ تعاون نہ کرنے پر جس طرح امریکہ اقتصادی پابندیاں لگادیتا ہے اس طرح قیدیوں کی ضروریات کنٹرول کر کے من پسند فیصلے کروائے جائیں۔ مجھے بھی کی بار کئی طریقوں سے ازمانے کی کوشش کی گئی۔ پندرہ سال بعد مجھے ایک چھوٹا ساٹی وی سیٹ دیا گیا۔ جب سیکورٹی نے سوچا کہ اب میں ٹوی وی کا عادی ہو گیا ہوں گا تو انہوں نے عجیب و غریب مطالبے شروع کر دیے۔ میرے انکار پر انہوں نے دھمکی دی کہ میں عدم تعاون کے نتیجے میں میری کچھ مراعات واپس لے لی جائیں گی۔ یہ کہتے ہوئے ایک افسر نے میرے ٹوی کی طرف دیکھا۔ میں نے خود وہ ٹوی وی اٹھا کر دروازے کے باہر رکھ دیا۔ دوسرے افسر نے میرے تیکی کی طرف دیکھا مگر میں نے تیکیہ اور میٹریس دونوں اٹھا کر بازار پھینکے دیے۔ پھر وہ پوچھنے لگے میں میٹریس کے بغیر کیسے سوسکونگا؟ میں نے فرش پر دراز ہو کر کٹا ٹانگ پر ٹانگ رکھی۔ دونوں ہاتھوں کی لگنگی مار کر سران کے اور پر رکھ کر کہا۔۔۔ میں ایسے سولوں گا۔ انہوں نے کہا گلتا ہے کہ تمہاری کھوپڑی نے کام کرنا بند کر دیا ہے (It seems you are cracking up) یہی بات سیکورٹی نے گورنر کو بتائی۔ گورنر نے سیکورٹی کو کہا راجہ کی کھوپڑی نہیں تمہاری خراب ہے۔ جاؤ اسکا سامان واپس اس کے سیل میں رکھو۔

میری والدہ فوت ہوئیں تو انہوں نے سوچا میں ان سے فون کاں کی بھیگ مانگوں گا کیونکہ اکثر قیدی ایسے موقع پر ہمدردانہ فون کالیں اور اضافی ملاقاں تیں مانگتے رہتے ہیں لیکن میں نے کچھ نہ مانگا۔ جب قیدی خاموش ہو جائے تو سیکورٹی کو یہ بھی خطرہ ہوتا ہے یہ خود کشی نہ کر لے۔ قیدی کی

خاموشی کو دخوکشی کا ایک اشارہ تصور کیا جاتا ہے۔ ان کو معلوم تھا کہ میں خود کشی کرنے والا نہیں لیکن جب میں نے فون کال مانگی نہ ملاقات تو سیکورٹی نے پادری کو میرے پاس بھیجا۔ اس نے میرے اور اپنے نبی کے فرمادات سنانے شروع کیے۔ اس نے کہا کہ میں اگر گھر بات کرنا چاہوں تو کر سکتا ہوں۔ میں نے کہا میری والدہ نے یہاں آ کر وزیرِ اعظم کو ایک خط کے ذریعے کہا تھا کہ میرا بیٹا حج کی دی ہوئی سزا کاٹ چکا ہے۔ اب اسے سیاسی بنیادوں پر کیوں قید کر رکھا ہوا ہے تو میری والدہ کو غیر مناسب جواب دیا گیا۔ اب وہ دنیا سے چل بسی ہیں اور آپ کی حکومت مجھے ہمدردانہ فون کال دینا چاہتی ہے۔ میں ایسی فون کال کو کیا کروں؟ ایسی مشکل اور جذباتی صورت حال پر بھی قیدی کے عمل پر پورٹ تیار کی جاتی ہے۔ کچھ قیدی جذبات میں آ کر دشمن طرازی پر اتر آتے ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشنگوار حیرت ہوئی کہ اس موقع پر مجھ پر لکھی گئی روپورٹ میں کہا گیا کہ ماں کی وفات پر مسٹر راجہ کارو یہ انتہائی پروتار تھا۔

000

عدالتوں کے تاریخی فیصلے

گورنمنٹ نے سیاسی دباؤ کی وجہ سے ہماری سزا خفیہ رکھ کر بہت زیادتی کی لیکن بعد میں اپیل کو روٹ کھل کر روزیر دا خلہ کے خلاف ڈٹ گئیں۔ آٹھ دسمبر 1994 کی سرد ہواں میں برطانیہ بھر سے پر جوش قائل فرقہ کی قیادت میں لندن ہائی کورٹ پہنچے۔ میری وکیل سمیعیہ بھی وہاں موجود تھی۔ تین رکنی ہائی کورٹ نجی کی سربراہ لیڈی جسٹس بتلر سلس تھیں۔ دونوں طرف کے وکلاء کی بحث سننے کے بعد جسٹس سلس نے اپنے ریمارکس میں کہا کہ ہوم منٹر کا کروار ایک کرکٹ ٹیم کے کیپین کی طرح کا تھا جو ساری وکٹیں اٹھا کر لے جائے اور کھلاڑیوں کو کہے کہ پینگ کرو۔ ان ریمارکس سے اندازہ ہو گیا تھا کہ فیصلہ ہمارے حق میں ہو گا۔ عدالت نے فیصلے کے اعلان کے لیے ایک ہفتہ بعد 16 دسمبر 1994 کی تاریخ رکھی جس سے پہلے چلا کر گورنمنٹ نے خفیہ طور پر دس دس سال آگے کر دیا۔ اصل مقصد ہمیں تاحیات جیل میں رکھنا تھا لیکن عوامی ردعمل روکنے کے لیے اسکا اعلان نہ کیا۔ 16 دسمبر کو عدالت نے ہماری خفیہ سیاسی سزاوں کو کاعلام قرار دے دیا مگر برٹش گورنمنٹ نے تاخیری حرbe استعمال کر کے پھر اسے دو سال تک لٹکائے رکھا۔ ہم نے یورپی انسان حقوق کی عدالت میں رٹ دائر کی۔ اس موقع پر ہماری لیگل فرم کا نام باٹھ مرغی تھا جو ایک سکھ اور انگریز کی مشترکہ لیگل فرم تھی۔ اس نے ڈٹ کر ہمارا کیس لڑا جس کے نتیجے میں ریاض بیس اور میں تقریباً ۲۲ سال بعد بری ہوا۔ میں مہاترے کیس کا آخری قیدی تھا۔ ادھر یورپی انسانی حقوق کی عدالت میں میرے حق میں فیصلہ ہوا اور ادھر امریکہ میں اسلام مرزا گرفتار ہو گیا۔ پولیس میرے پاس ہائی پوائنٹ جیل میں ملنے آئی اور مہاترے کیس میں اسلام مرزا کے کروار بارے بیان لینے کی کوشش کی۔ میں نے دلوں کہا کہ میرا بیان وہی ہے جو کیس سال پہلے دیا تھا مگر پولیس ہر روز کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے جیل پہنچ آتی۔ میں نے

اسلم مرزا کے ایک رشتہ دار کو جیل میں بلا کر کہا کہ کسی طرح اسلام کو بتا دیں کہ میں کوئی بیان نہیں دوں گا اور وہ بھی خاموش رہے تو نجح جائے گا اور یہی ہوا لیکن پولیس نے میرا پیچھا تب چھوڑا جب میں نے دھمکی دی کہ میں انہیں بلیک میل کرنے کے جرم میں دوبارہ یورپی انسانی حقوق کی عدالت میں لے جاؤں گا۔ اس وجہ سے مجھے مزید تین ماہ جیل میں رہنا پڑا۔

عام طور پر جب کسی قیدی کی رہائی کا فیصلہ ہوتا ہے تو آرڈر جیل انتظامیہ کو بھیجا جاتا ہے لیکن حیران کن طور پر میری رہائی سے پہلے ایک نجح اور وزارت داخلہ کے نمائندے جیل میں آئے جہاں مجھے کہا گیا کہ میں اپنی فیملی کے ایک نمائندے کو بھی دعوت دے سکتا ہوں۔ میں نے جیل انتظامیہ کو اپنی بھتیجی شاہدہ کا نام دیا جسے تحریری دعوت نامہ بھیجا گیا۔ اس نے کچھ عرصہ قبل ہالینڈ سے انگلینڈ نقل مکانی کی تھی۔ ملاقاتی ہال کو کافرنس روم میں بدل کر اس کے چاروں طرف پہر الگا دیا گیا جس میں جیل خانہ جات کے تمام شعبوں کے نمائندے مجھ سے پہلے بلا لیے گے۔ اس دن پوری اسیری کے دوران پہلی بار مجھے سوٹ زیب تن کرنے کی اجازت دی گئی۔ سیکورٹی مجھے سیل نمبر چوبیں سے لینے آئی تو میرا سوٹ دیکھ کر کہا آج کا دن تمہارے نام۔ میرے سیل اور کافرنس روم میں پانچ منٹ پیدل سفر تھا۔ کافرنس روم کے صدر دروازے پر مائن فسیات کھڑی تھی۔ یقیناً اسے یہاں میرا جائزہ لینے کے لیے کھڑا کیا گیا تھا۔ اس نے مجھے سوٹ میں دیکھ کر ہا۔ ۔۔۔ واؤ۔۔۔ جسے ہم ماشال اللہ کہہ سکتے ہیں۔ چند قدم آگے میرا انگریز و کیل کھڑا تھا۔ وکیل نے ایک ہاتھ سے کافرنس روم کا دروازہ کھولا اور دوسرا ہاتھ سے مجھے میرا بازو پکڑ کر اندر داخل ہونے کی دعوت دی۔ دروازے کے عین سامنے نجح صاحب بیٹھ ہوئے تھے اور دائیں بائیں دو جنپی انگریز تھے۔ نجح صاحب نے اپنی سیٹ سے ہاتھ آگے کرتے ہوئے کہا۔ مسٹر راجہ تشریف رکھیے۔ میں جوں ہی اپنی سیٹ پر بیٹھنے لگا تو میرا وکیل میرے دائیں اور اور پر ویسین افسر میرے دائیں نشست پر بیٹھ گئیں جس کا مطلب تھا کہ آج پر ویسین افسر بھی میرے حق میں بیان دے گی۔ میری بھتیجی اور مائن فسیات کو نجح اور وزارت داخلہ کے نمائندوں کے باکیں طرف بٹھایا گیا۔ میں انھی سوچ ہی رہا تھا کہ میری رہائی کا فیصلہ تو ہو چکا ہے اور اب یہ عدالت لگانے کا کیا مقصد؟ اتنے میں نجح صاحب نے اپنے چشموں کو اوپر نیچے کیا اور یوں گویا ہوئے: مسٹر راجہ میں نے آپ پر جیل انتظامیہ کی مرتب کردہ روپورٹ پڑھی ہے۔ میں نے اپنے کیریئر میں کسی قیدی پر جیل انتظامیہ کی طرف سے اتنی اچھی روپورٹ نہیں پڑھی۔ میں آپ کو سلام کرتا ہوں کہ آپ نے

اتی مشکلات میں جیل کے اندر انتہائی ثابت وقت گزارا ہے۔ قیدیوں کے حقوق کے لیے ہمیشہ کمر بستہ رہے مگر ساری کاؤنٹیں جائز اور قانونی حدود قیود کے اندر رہ کر کیں۔ ریس ریلیشنز کے حوالے سے جیل انتظامیہ نے اپنی علمی، لسانی اور مکالمہ کی صلاحیتوں سے استفادہ کیا۔ میں آپ کی خدمات کا شکر یہ ادا کرتا ہوں اور مجھے افسوس ہے کہ آپ ابھی تک جیل میں ہیں لیکن چونکہ آپ واپس وطن جانا چاہتے ہیں، اس کا انتظام اب برطانوی اور پاکستانی حکومتوں نے کرنا ہے ورنہ میں آج آپ کی رہائی کا اعلان کر کے جاتا۔ اور ہاں میں نے آپ کے مستقبل کے پلان پر مبنی وہ خط پڑھا جس کی دعوت جیل گورنر نے دی تھی۔ بری ہو کر شادی کرنا اور فیملی لائف بنانا آپ کے مستقبل کے منصوبوں میں شامل ہے۔ میں آپ کو قبول ازدواجی مبارک باد دینا چاہتا ہوں۔ نج نے پھر میری بھتیجی کو مناطب کرتے ہوئے کہا مجھے امید ہے آپ اپنے چھا کا خیال رکھیں گی۔ نج کے اس بیان اور روز یہ داخلہ کا ہمارے ساتھ سلوک کا موازنہ کیا جائے تو کوئی لیقین نہیں کر سکتا کہ یہ دونوں ایک ہی ملک سے تعلق رکھتے ہیں۔ نج صاحب نے جب کہا کہ واپس جانا آپ کا اپنا فیصلہ ہے تو اس سے اشارہ دینا تھا کہ میں اپنا ارادہ بدل بھی سکتا ہوں لیکن وطن اور ہم وطنوں سے محبت اور طویل جدائی کا درد مجھے واپس لے آیا۔ واپسی پر مجھے اپنے لوگوں سے جہاں بے پناہ محبت ملی وہاں حکومتی ہتھکنڈے بھی ناقابل بیان ہیں۔ مجھے آج تک مالی طور پر مستحکم نہیں ہونے دیا گیا۔ مجھے یہ کچھ رتعینات کروانا مرحوم وزیر تعلیم مطلوب انقلابی کی دلی خواش تھی لیکن خفیہ قوتوں کا اصرار تھا کہ میں سیاست چھوڑ دینے کا عہد کروں۔ میں نے کہا جو سیاست میں کر رہا ہوں یہ سب کو کرنی چاہیے۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی جبکہ دو مرتبہ کسی کے ساتھ مشترک کاروبار کو ناکام بنا دیا گیا۔

وسلیے : کر بھلا ہو بھلا!

روحانیت، صبر اور درگزر کے ثابت نتائج پر میرا پختہ لیقین ہے۔ وقت طور انا کو دفن کرنا پر تا ہے لیکن مستقبل میں اس کا فائدہ ہوتا ہے۔ صبر کا انعام مل کر ہی رہتا ہے۔ دو مرتبہ مجھے کاروبار میں سازش کے تحت دھوکہ دیا گیا۔ دھوکہ باز بھی سزا اور سوا ہونے سے نہ نج سکے لیکن یہ واضح ہو گیا تھا کہ خفیہ قوتیں چاہتیں کہ میں مالی طور پر مستحکم ہوں۔ کاروبار میں دھوکہ دی کے بعد ہماری گزر اوقات صرف میری اہلیہ کی تنجواہ پر تھی جو ایک سرکاری معلمہ ہیں۔ تین چھوٹوں کی تعلیم، معاشرے میں باقی ضروریات اور تحریکی اخراجات اہلیہ کی تنجواہ سے پورے کرنا ناممکن تھا لیکن جوں ہی دوسری بار مجھے

کاروبار میں دھوکہ دیا گیا تو مختلف لوگوں کی سخاوت سے بھی استفادہ ہونا شروع ہو گیا۔ جیرت کی بات تھی کہ ان میں سے اکثریت ایسی شخصیات تھیں جن کو میرے ساتھ ہونے والے کاروباری دوکھوں کا کوئی علم نہ تھا۔ یقیناً یہ بینی وقت کے فیصلے تھے۔ وقت فوقتاً ملنے والی امداد اتنی تو نہ تھی کہ میں کوئی کاریا بلکہ خرید لیتا جو کبھی میرا مطبع نظر ہی نہیں رہا لیکن میری سفید پوشاں کا پرداہ قائم رہا۔ ایک شریف ادمی کے لیے یہ بہت بڑی نعمت ہے جو اسے غیروں کی نظر میں زلیل و خوار ہونے سے بچا لیتی ہے۔ اپنی ضرورتوں کو کم کر کے مشکل وقت میں کسی کے کام آ جانا بھی ہر لحاظ سے فائدہ مند ہے۔ میں نے جون ۹ ۲۰۱ کو ایران جانے کا پروگرام بنایا تو جانے سے پہلے بیٹیوں کے لیے کھڑے خریدنے تھے۔ گھر سے نکلنے کا تو ایک ادمی ادھار مالگئے آ گیا۔ سفید پوشاں ادمی تھا کہنے لگا کسی اور سے مانگا تو پرداہ نہیں رہے گا۔ میں نے پیسے اسے دے دیئے۔ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ میں اپنا بجٹ کیسے ایڈ جسٹ کرو گا تو ایک کال آئی کہ ایک دوست میرے ایک عزیز کو خط دے گیا ہے۔ خط وصول کیا تو اس میں عید کے تحفوں کے لیے کچھ رقم تھی۔

جوں ہی عمران خان کی حکومت قائم ہوئی تو مہنگائی بڑھ گئی۔ مارچ میں ہوئی جہاز کی جو ٹکٹ اٹھتیں ہزار روپے تھی وہ جون میں ستر ہزار سے کم نہیں مل رہی تھی جس کے نتیجے میں مجھے بائی روڈ جانا پڑا لیکن اسلام آباد سے لے کر ایران تک ایسے دیلے بنتے رہے کہ میں صرف ۱۱ ہزار روپے میں ایران داخل ہو گیا۔ راستے میں محمودا چکرنی کے حامی مل گئے جنہوں نے میری دیکھ بھال کی۔ کوئی نہ میں تعینات باغ سے تعلق رکھنے والے کشمیر افسر اسلام کشمیری صاحب نے میری بہت خدمت کی۔ ان کے تعاون سے میرا آگے کا سفر بہت آسان رہا۔ تفتان بارڈر پر ایرانی امیگریشن افسر نے مسکراتے ہوئے پوچھا: پڑھان، پنجابی یا کشمیری؟ میں نے کہا کشمیری۔ پھر پوچھا: ضلع؟ میں نے کہا کوئی۔ تحصیل؟ میں نے کہا ایم اے۔ (فارسی میں تحصیل تعلیم کو کہتے ہیں)۔ آخری سوال تھا: شعبہ؟ میں نے کہا نفیاں اور سو شش سائنسز۔ ایرانی امیگریشن افسر نے میرے پاسپورٹ پر سٹمپ لگائی اور کہا موفق باشید (خدا کامیاب کرے)۔

امیگریشن افس سے باز نکلنے کے بعد بس سٹیشن تک میکسی کرنی پڑتی تھی جو پونا گھنٹے کا سفر تھا اور کافی مہنگی پڑتی تھی لیکن وہاں ایک میاں بیوی کھڑے تھے جنہوں نے جو بس سٹیشن پر جا رہے تھے اور مجھے بھی ساتھ بٹھا لیا۔ بس سٹیشن سے مشہد کے لیے کوچ لی۔ بارہ گھنٹے کے سفر کے دوران ایک

ایرانی نے مجھے اپنا امنیت کے لیے ہاتھ سپاٹ دے دیا۔ میں نے فردوی یونیورسٹی جانا تھا۔ فون کیا تو پہتہ چلا یو نیورسٹی ایک ہفتہ کے لیے بند ہے۔ حرم امام رضا کے سامنے ایک دکاندار کو میں نے کہا میں کشمیری ہوں اور وہ مجھے کوئی مناسب ہو ٹل ایک ہفتہ کے لیے بک کروادے۔ وہ دکاندار افغانی تکلا جس نے گھر فون کر کے اپنی والدہ اور اہلیہ سے مشورہ کر کے مجھے اپنے گھر لے گیا۔ پورا ہفتہ انہوں نے میری میزبانی کی۔ یو نیورسٹی کھلی تو وہ مجھے اپنی کار پر وہاں چھوڑ آیا۔ یو نیورسٹی میں مجھے ہنڑہ کی ایک محصومہ نامی پی ایچ ڈی سکالر میں جس نے میری بہت رہنمائی اور مدد کی۔ یو نیورسٹی میں میرے بے شمار عربی، ایرانی، افغانی اور سلطی ایشیائی دوست بن گئے جہاں میرے یادگار تین ماہ گزرے۔

ایران میں سیاسی و سفارتی سرگرمیاں:

پہلی بار مارچ 2019 میں کربلا سے ایران گیا تھا۔ کربلا کے لیے میں نے لاہور سے نجف کی فلاہیت لی تھی۔ نجف سے کوفہ میں جائے شہادت حضرت علی کی زیارت کی جہاں ملعون ابن معلجم نے زہریلی تلوار سے حضرت علی پر وار کیا تھا۔ وہاں سے کربلا گیا جہاں حضرت امام حسین کے مزار اور پیغمبر ان اسلام کی زیارتؤں پر حاضری کے بعد بائی کوچ ایران کے دوسرے بڑے مذہبی شہر قم عازم سفر ہوئے۔ راستے میں حضرت ابراہیم علیہ سلام کی زیارت آتی ہے۔ قم میں تین دن قیام کے بعد براستہ تہران مشہد پہنچا جہاں ایک ہفتہ ٹھہرا۔ مکمل زیارتی دورہ تھا لیکن وہ سفر ہی کیا جس میں کشمیر اور مشاہیر کا ذکر نہ ہوا۔ ایران کے قومی شاعر ابوالقاسم کے نام پر قائم فردوسی یو نیورسٹی سے تعلق رکھنے والے کچھ انتظامی افسران نے مجھے دعوت دی جس کے لیے میں دوبارہ تین ماہ بعد ایران گیا۔ فردوی یو نیورسٹی میں زیر تعلیم پی ایچ ڈی سکالر زڈ اکٹرزین، خانم مہیوش اور ہنڑہ سے تعلق رکھنے والی محترمہ محصومہ نے مجھے تاریخی مقامات کا دورہ کروایا۔ ایران کے ایک بڑے روزنامہ خراسان نے ایران اور کشمیر کے تاریخی و ثقافتی رشتہوں پر میرا انسٹرو یو بھی کیا۔ اس دوران ایران کی کچھ شخصیات سے ملاقاتیں ہوئیں جنہوں نے جموں کشمیر کے حوالے سے اس وقت کے پاکستانی وزیر اعظم عمران خان کی امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کے ساتھ وائٹ ہاؤس میں ملاقات کے حوالے سے کہا کہ کشمیر بارے کچھ ہونے والا ہے۔ مجھے جو معلومات ملی اس کی روشنی میں میں نے انگریزی روزنامہ تہران ٹائمز میں ایک تحریکی کالم لکھا جس میں جن خدشات کا اظہار میں نے کیا وہ بھارتی وزیر اعظم زیندرا مودی کے

پانچ اگست 2019 کے اعلان کی شکل میں درست ثابت ہو گیا۔ اس اعلان میں جوں کشمیر کی خصوصی حیثیت ختم کر دی گئی تھی۔ اس اعلان کے بعد میں نے اپنی سیاسی ملاقاتوں کا سلسہ تیز کیا مگر مجھے زیادہ کوشش کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ ایران کے دفتر خارجہ نے دو مرتبہ اپنی بریفنگ میں بھارتی فیصلے کی مذمت کی۔ ایرانی پارلیمنٹ جسے وہ مجلس کہتے ہیں نے ایک مذمتی قرارداد منظور کی جبکہ ایران کے روحانی رہنماء آیت اللہ خامنی نے بھی دو مرتبہ مسئلہ کشمیر پر پریس کانفرنس کی جس میں بھارتی فیصلے کو غیر قانونی قرار دیتے ہوئے مسئلہ کشمیر کو کشمیریوں کی امنگوں کے مطابق حل پر زور دیا۔ پندرہ اگست 2019 کو ایران کے تمام بڑے شہروں میں بھارت اور اقوام متحده کے خلاف مظاہرے ہوئے۔ اقوام متحده کے دفتر کو یادداشت پیش کی گئی۔ ان مظاہروں میں ایرانی مظاہرین کا سب سے مقبول اور زوردار نعرہ تھا: کشمیر نہما نست۔ مشہد میں اس مظاہرے کی قیادت مقامی رکن پارلیمنٹ ڈاکٹر نصر اللہ پژفرمان نے کی۔ مجھے اس میں شرکت کے لیے خصوصی طور لے جایا گیا اور انتظامیہ مجھے خود واپس میری عارضی رہائش گاہ پر چھوڑ کر گئی۔ وطن والپی سے پہلے ایک بار پھر رکن پارلیمنٹ ڈاکٹر نصر اللہ سے ملاقات ہوئی جس میں ایران کی حمایت کا شکر یہ ادا کرتے ہوئے اخلاقی تعاون جاری رکھنے کی درخواست کی گئی۔ تیسرا بار میں چھاگست 2023 کو تہران گیا جہاں دفتر خارجہ کو یادداشت دی اور پریس کانفرنس بھی کی۔ ایرانی میدیا نے اس بار بھی ہمارے بیانیہ کو اجاگر کیا۔ نصف صدی سے اقتصادی پابندیوں کے باوجود اس کی خارج پالیسی مصلحت کا شکار نہیں ہوئی۔ اس دفع میں صرف ایک ہفتے کے لیے گیا تھا جس کی وجہ سے سیاسی ملاقاتیں صرف تہران میں ہوئیں جبکہ جوں کشمیر سے ہمدردی رکھنے والے لوگ ایران بھر میں موجود ہیں۔ اگر ہم جزوی افریقہ اور فلسطین کی طرح سفارتی شعبہ کو متحرک کریں تو بے شمار ممالک میں ہماری شناوائی ہو سکتی ہے لیکن ہماری تحریک یک سڑیٹ پالیسیس تک محدود ہے جس پر فوری نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

000

رہائی کی نوید

پاکستان کے قائم مقام ہائی کمیشنر کی جیل میں میرے ساتھ آخري ملاقات:

۱۶ مئی ۲۰۰۵ء شام سات بجے سیکورٹی مجھے جیل گورنر کے دفتر میں لے گئی۔ وہاں پاکستان کے قائم مقام ہائی کمیشنر مزاد علی خان اور میرا بھاجنا شکیل بیٹھے ہوئے تھے۔ شکیل کو ہائی کمیشنر نے اس لیے ساتھ لایا تھا کہ انہیں جیل کا راستہ معلوم تھا۔ قیدیوں کی ملاقات کا وقت چار بجے ختم ہو جاتا ہے۔ ملاقاتیں بھی متعین ملاقاتی ہاں میں ہوتی ہیں۔ اس لیے جب میں نے ہائی کمیشنر کو دیکھا تو مجھ گیا کوئی حتمی فیصلہ ہونے والا ہے۔ ہائی کمیشنر نے مجھے سفری لیٹر دکھاتے ہوئے کہا میں کل پاکستان جا رہا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ ہائی کمیشن میری ہر چیز کو فالکرتا رہا ہے لیکن اب آپ کو اپنے رویے پر نظر ثانی کرنی پڑے گی۔ میں یہاں اس لیے مسکرا دیا کہ ایک دفعہ ہائی کمیشن نے مجھے پوچھا تھا کہ میں جیل میں کیوں ہوں اور اب کہتے ہیں وہ میری ہربات سے واقف ہیں۔ میری ہربات سے واقعیت کا مطلب میرے ان اخباری بیانات کی طرف اشارہ تھا جن میں پاکستان کی کشیر پالیسی پر تنقید ہوا کرتی تھی۔ سینئر سیکورٹی افسر ٹام کنگ بڑی توجہ سے ہماری گفتگوں رہا تھا۔ طویل القامت گندی رنگ کے ہائی کمیشنر مزاد علی خان نے مجھے پوچھا کہ آیا حکومت کی طرف کوئی پیغام ہے؟ میں نے کہا میں چھیس سال بعد وطن واپس جا رہا ہوں۔ اس دوران میرے خاندان کے نصف بزرگوار ان دنیا سے چل بیسے ہیں جن میں میری والدہ اور بھائی بھی شامل ہیں۔ جب میں جہاز سے اتروں گا تو شاید دنیا سے چلنے والوں کی وجہ سے میرا موڑ ٹھیک نہ ہواں لیے ہوائی اڈے پر میرے ساتھ کسی قسم کی سیاسی گفتگوں کی جائے۔ ضروری ہو تو بعد میں مناسب وقت پر بات ہو جائے گی۔ ہائی کمیشنر نے مسکرا کر کہا یہ میں کہہ دوں گا۔ مزید کوئی بات؟ ہائی کمیشنر نے پوچھا۔ میں نے کہا میرے پاس قیمتی

دستاویزات ہیں۔ ان کی حوالگی یقینی بنائیں۔ ہائی کمشنر نے کہا یہ بھی ہو جائے گا اور ہو بھی گیا۔ رات بھر میں اپنے جذبات کو قابو کرنے کے لیے ورد اور ورش کرتا رہا۔ جیل حکام میرا سارا سامان اٹھا کر استقبالیہ پر لے گے۔ میرے پاس صرف ایک پلیٹ، گلاس اور پیالہ چھوڑا جس میں مجھے صحیح ناشتہ کرنا تھا۔ جیل میں آخری رات یوں تو دنیا سے رخصت ہو جانے والے سارے دوست و عزیز یاد آئے لیکن دو ماہوں زاد بھائی راجہ محمد ایوب خان اور پولیس اسپکٹر راجہ افسر خان کی یاد نے بہت ستایا کیونکہ بھائی آیوب خان کی موت ایک در دن اک واقعہ اور بھائی افسر کی عین جوانی میں ہوئی تھی۔ والدہ صاحبہ کی کانوں میں پڑھنے والی آخری آواز اور بڑے بھائی نذر صاحب کا وہ چہرہ جو میں نے جیل سے سیکورٹی کے زرع میں خصوصی انتظامات کے نتیجے میں دیکھا تھا وہ مجھے سونے نہیں دے رہے تھے۔ مجھے معلوم تھا اگلے چند دن مجھے اچھی طرح سونے کا موقع نہیں ملے گا۔ میں سونا چاہتا تھا لیکن یادیں اور با تین مجھے سونے نہیں دے رہی تھیں۔ رات کو میرے ونگ کے انچارج نے ماسٹر چاپی کے ساتھ میرا دروازہ کھولا اور کہا کہ اس کی ڈیلوٹی ختم ہونے والی ہے اور وہ مجھ سے صحیح نہیں مل پائے گا۔ مجھے کہا کہ انہائی مشکل حالات میں آپ کارویہ، بہت اچھا رہا۔ اس نے نیک خواتیشات کا انہصار کیا اور مصافحہ کر کے چلا گیا۔ بری ہونے والے قیدیوں کے ساتھ ایسا بہت کم ہوتا ہے کیونکہ قیدیوں کی عزت افزائی کو جرام کی حوصلہ افزائی کے مترادف تصور کیا جاتا ہے لیکن اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ میں نے حکومت کے خلاف سیاسی و قانونی جنگ کو جیل انتظامیہ کے ساتھ معاملات سے الگ رکھا۔ دوسرا وجہ یہ تھی کہ انگریز بڑے قوم پرست ہیں۔ ان کی اب کوشش تھی کہ میں ان کے ہاتھ سے نکلنے والا ہوں اور وہ اپنے بارے میرا رویہ نرم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ڈسچارج رجسٹر پر دستخط

عام قیدی جب بری ہوتے ہیں تو انہیں روٹین کے مطابق باقی قیدیوں کے ساتھ ناشتہ کرو اک جیل گیٹ پر چلے جانے کے لیے کہا جاتا ہے مگر مجھے قیدیوں کے جانے سے ایک گھنٹہ پہلے ہی اندر ہیرے میں آ کر ناشنیدیا گیا جس کے بعد سیکورٹی مجھے جیل گیٹ پر لے گئی۔ اپنے ونگ یا وارڈ کے گیٹ سے نکلتے وقت میں نے پیچے مرکر دیکھا تو تمام قیدیوں کے سیلوں کی کھڑکیاں بند تھیں۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ میں بری ہو رہا ہوں۔ جیل کا ایک قیدی ملازم اور تمام اچھی بری با تین ایک لمحے

کے لیے میرے دناغ میں گھوم کہیں۔ جیل گیٹ پر پہنچا تو وہی سینئر افسر کنگ اسٹبلیو روم میں موجود تھا۔ اس نے میرا سامان میرے حوالے کرتے ہوئے سامان کی لست دکھائی کہ آ کوئی چیز غائب تو نہیں۔ اس سامان میں میرا وہ بٹوا بھی تھا جو میری گرفتاری کے وقت مجھ سے لے لیا گیا تھا۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا تو میرے وہ سارے پیسے اس میں موجود تھے جو میری گرفتاری کے وقت اس بٹوے میں تھے۔ افسر کنگ نے کہا مجھے ڈسپارچ رجسٹر پر دخنٹ کرنے کے لیے کہا۔ ابھی میں نے قلم پکڑا ہی تھا کہ کہا مسٹر راجہ مجھے یقین نہیں آ رہا کہ آپ جا رہے ہیں۔ میں نے کہا مسٹر کنگ بعض اوقات غیر متوقع باتیں بھی ہو جایا کرتی ہیں۔ مجھے میری والدہ کی وہ بات یاد آئی جو انہوں نے میری گرفتاری کے وقت حوصلہ دیتے ہوئے پہلے خط میں لکھی تھی کہ بیٹا بے شک برطانیہ ایک طاقتوں ملک ہے لیکن اللہ سب سے بڑا ہے۔ ڈسپارچ رجسٹر پر میں نے اپنی رہائی کے دخنٹ کیے ہی تھے کہ میڈیکل سٹاف کی ایک خاتون آگے بڑھی اور کہا یہ چھ ہفتے کی ادویات ہیں۔ مجھے چھیڑتے ہوئے کہا مجھے معلوم ہے آپ مصروف ادمی ہیں لیکن چھ ہفتے بعدا پکو دوائیاں لینے کا وقت مل جائے گا۔ اب سارا سٹاف میرا رویہ زم کرنے کے لیے میرے ساتھ شراریں کر رہا تھا۔ لیڈی نے مسکراتے ہوئے ایک اور شراری کی By the way, why were you in prison?: جیل سے نکلتے وقت اکثر قیدی دل کی بھڑاں نکال کر جاتے ہیں۔ میں چونکہ خاموش تھا تو مجھے بھی ازمانے کی کوشش کی گئی لیکن الحمد للہ۔ میں نے کہا۔ ڈارنگ۔ اگر اپکو بھی تک نہیں معلوم تو کبھی معلوم نہیں ہو گا۔ وہ گذ بائی کہہ کر غائب ہو گئی۔ اتنے میں چاک و چوبندو جوان افسران کی ایک ٹیم نے مجھے گھیر لیا۔ انہوں نے جیل کے اندر ہی مجھے ایک کار میں بٹھایا۔ گیٹ کے باہر سیکورٹی کا نواۓ تھا۔ میری کار کا نواۓ کے درمیان میں تھی۔ کچھ کیسرہ میزبر بھی نظر آئے مگر ان کو میری تصویر بنانے کا موقع نہ ملا لیکن ٹیم وی پر میری رہائی کی خبر نہ شہر ہو گئی۔ جو بعض کشمیری اور پاکستانی مجھے برطانوی حکومت کو سیاسی و قانونی جدوجہد کرنے سے ڈرایا کرتے تھے کہ اتنی طاقتوں ریاست کے خلاف کیس جیتنا مشکل ہے اور معافی تلافی کا راستہ نہ کالو، وہی مبارکیں دینے میں سب سے آگے تھے: مسلماً ایک صاحب نے کہا: واه۔ جی واه۔ پتہ چلا کوئی قیدی بری ہوا۔ ایسے لوگ خوش بھی جلدی ہوتے ہیں اور مایوس بھی۔

سیکورٹی کا کھیل

ایک گھنٹے بعد سیکورٹی انچارج نے مجھ کہا بڑی خبر ہے۔ پوچھا کیا تو کہنے لگا ہوم آفس آپکی فائل نہیں لاسکا جس کی وجہ سے ہم مانچستر ائر پورٹ پر چلنے کے بجائے لندن چلیں گے۔ شاید ایک اور رات آپ کو جیل رہنا پڑے مگر آپ فکر نہ کریں ایک دن ہی کی توبات ہے۔ ۲۲ سال بعد جیل سے باز نکلا یقیناً ایک غیر معمولی عمل تھا لیکن میں نے ہر حال میں خود کو ٹھنڈا رکھنا تھا۔ میں نے دیکھا کہ سڑک پر مانچستر کے سائنس بورڈ کے بجائے اب لندن کا سائن بورڈ تھا۔ مجھے یقین ہو گیا وہ مجھے لندن لے کر جا رہے ہیں جس کی بعد میں وجہ معلوم ہوئی کہ مانچستر ائر پورٹ پر میرے حامیوں کی بھاری تعداد جمع ہو گئی تھی۔ خبر شاید میرے بھانجے اور پاکستان ہائی کمیشن کے ذریعے نکلی تھی۔ ایک گھنٹہ لندن کسی خفیہ مقام پر رکھنے کے بعد بالپھل پیدا ہوئی۔ سیکورٹی کی ٹیم آئی۔ جس ٹیم نے مجھے جیل سے لا یا تھا اس کے ساتھ ایک خاتون تھی۔ وہی اس سیکورٹی ٹیم کی انچارج تھی۔ الوداعی سلام کے وقت وہ اچانک میرے قریب آئی۔ اس کے چہرے پر سنیدگی طاری تھی۔ اس نے پوچھا آپ کی انگلینڈ کی آخری یاد کیا ہے؟ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے آگے لپک کر میرے گالوں پر گرما گرم چوما دے ڈالا اور کہا ہے یہ ہو گی آپکی آخری یاد۔ یہ سب اپنے ملک بارے میرے رویے کو زرم کرنے کی کوششیں تھیں کیونکہ انہیں میرے ساتھ اپنی حکومت کے رویے کا علم تھا لیکن انہیں خطرہ تھا کہ میں آزاد فضا میں جانچتے ہی سب سے پہلے سیاسی زیادتوں کا ذکر کروں گا مگر پاکستان جیسا تابع دار ملک انگریزوں کو کہاں ملے گا۔ برٹش حکومت کی خواش کے مطابق پاکستان کی حکومت نے اسلام آباد ائر پورٹ پر منتظر میدیا یا تور کنار میرے دوستوں اور رشتہ داروں کو بھی مجھ سے نہ ملنے دیا۔ اسلام آباد سے مجھے پاکستان کی ایجنسیوں کی ایک ٹیم خفیہ طور پر کھوئی رہ لے آئی اور استقبالی قافلہ ائر پورٹ پر منتظر کرتا رہا۔ ایجنسی کے جس ادمی نے مجھے جہاز کی سیر ہیوں سے اترتے وقت خوش آمدید کہا اس نے اپنا نام کریم طارق بتایا جبکہ آئی بی آزاد کشمیر کے ھید راجہ محمد شفیق خان بھی ہمراہ تھے جو دو یافتحے بعد ایک کریم اور میجر کے ساتھ مجھے میرے گرد دوبارہ ملنے آئے تھے۔

پاکستانی حکومت کے ساتھ بات کرنے کا وعدہ میں نے کیوں پورا نہ کیا؟

جیل میں ملاقات کرنے والے قائم مقام پاکستانی ہائی کمشنر اعلیٰ خان کے سوال پر میں نے کہا تھا کہ ائر پورٹ پر تو نہیں لیکن دو تین ہفتے بعد حکومت سے بات چیت کر لیں گے۔ آئی بی وزیر اعظم کے ماتحت کام کرتی ہے۔ اسی لیے آئی بی آزاد کشمیر کے سربراہ راجہ شفیق احمد خان ایک گلکٹی کرنس اور لاہور سے تعلق رکھنے والے میجر کے ساتھ مجھے میرے گھر جب ملے تو میں نے ان کے ساتھ کوئی سیاسی یا برطانیہ میں گزرے دنوں بارے بات نہ کی۔ میری خاموشی دیکھ کر گفتگو کی حوصلہ افزائی کے لیے تھوڑی دیر بعد کرنس اور میجر قریبی مسجد میں نماز کے بہانے بارنسکل گے۔ میں نے پھر بھی کوئی خاص بات نہ کی تو راجہ شفیق احمد خان نے ایک اور ملاقات جس میں ہالینڈ سے آئے ہوئے راولاؤٹ سے تعلق رکھنے والے میرے مرحوم بھائی نزیر راجہ کے ایک دوست سردار خان اشرف خان بھی موجود تھے اس میں آئی بی آزاد کشمیر کے سربراہ نے مجھے مخاطب ہوتے ہوئے شکوہ لیا: راجہ صاحب آپ نے انگریزوں کی نہیں سنی ہماری کہاں سئیں گے۔ میں نے ازراہ قلن کہا اس پر آپ کو دکھ ہے یا خوشی۔ یہ حقیقت تو واضح ہو گئی تھی کہ برطانیہ نے میرے بارے پاکستان کو درست روپورٹ دی تھی کہ اس ادی نے خفیہ اداروں کے ساتھ کوئی تعاون نہیں کیا۔ جیل کے اندر بھارتی اداروں کی میرے ساتھ ملاقاتیں کروانے کی بھی کوشش کی گئی تھی لیکن میں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ میں کسی ایسے ادی سے نہیں ملوں گا جو خط کے زریعے مجھے ملاقات کی درخواست نہیں کرتا کیونکہ میں ملاقاتی کے پس منظر سے اگاہ ہونا چاہتا تھا۔ شاید اسی لیے جیل کے اندر اسلامی تعلیم دینے والے ایک پاکستانی استاد نے ایک بھارتی پنڈت خاتون کے ساتھ میرا یہ کہہ کر رابطہ کروایا کہ وہ میرے اخباری کالموں سے بڑی متاثر ہے۔ خط و کتابت کے بعد ایک دن وہ مجھے ملے آئی۔ اب اس کا اتنا پتہ سب کچھ میرے پاس تھا۔ فکر والی بات نہ تھی۔ جب مجھے ملاقاتی روم میں لے جایا گیا تو وہ پہلے سے وہاں موجود تھی۔ مجھے دیکھ کر ملنے کے لیے کھڑے ہو گئی۔ وہ میرے اتنے قریب ہو گئی کہ ہمارے درمیان سوئی کا بھی وقفہ نہ رہا۔ میں نے کہا تشریف رکھیں تو وہ شرمندہ سی ہو گئی۔ شاید اسکا خیال تھا کہ میں اسے گلے ملوں گا۔ دوران گفتگو میری توجہ حاصل کرنے کے لیے وہ اپنی تازہ مہدی والے ہاتھوں سے کھلتی رہی۔ ہاتھ واقعی بہت خوبصورت تھے۔ ایک موقع پر اس نے کہا آپ بہت قربانی دے چکے ہیں۔ اب آپکے انجوائے

کرنے کا وقت ہے جو آپکا حق ہے۔ ملاقات کے دوسرے دن پاکستانی قرآنی سٹڈی کے معلم نے بڑے پر جوش انداز میں مجھے پوچھا ملاقات کیسی رہی؟ میں نے کہا بہت اچھی رہی۔ ایک دن اس معلم نے مجھے کہا یہ بہت اچھی خاتون ہے اس سے شادی کر لیں۔ میں نے سوچا ہندوستان اور پاکستان ایک دوسرے کو برواشت نہیں کرتے۔ آخر ایک پاکستانی ایک بھارتی خاتون کے ساتھ میری شادی کیوں کروانا چاہتا ہے۔ شاید اس کی وجہ مجھے بھارتی ایجنت ظاہر کر کے بدنام کرنے کی سازش تھی تاکہ کشمیری میری حمایت کرنا چھوڑ دیں۔ اس سازش میں برطانیہ کا کوئی خفیہ ادارہ بھی ہو سکتا تھا جو ہمارے لیے قائم فرقہ میں کی سرگرمیوں سے تنگ تھے۔

بھارتی پنڈت خاتون سے میری شادی کی سازش کی وجہ؟

ہندوستان اور پاکستان دونوں کی ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ کشمیریوں کا اپنا بیانیہ پر موٹ نہ ہو بلکہ دنیا کو یہی تاثر دیا جائے کہ کچھ کشمیری بھارتی اور کچھ پاکستانی یکمپ میں ہیں۔ اس لیے میں جیل میں کسی بھارتی کے ساتھ ملاقات کے لیے رضامند نہ ہوا لیکن اس خاتون کے ساتھ صرف یہ جانے کے لیے ملاقات کی کہ آخر یہ پاکستانی معلم کیوں اس کی میرے ساتھ ملاقات کروانا چاہتا ہے۔ میرا شہبہ بالکل درست تھا کہ یہ معلم کسی ایجنت کے لیے کام کرتا تھا۔ اس خاتون کی خواش کے باوجود میں نے اسے دوبارہ ملاقاتی کا رُنہ بھیجا۔ پھر بھی پاکستانی حکام کے لیے میں نے کچھ گناہ کر کی ہوئی تھی کیونکہ جیسا کہ میں نے ایک پاکستانی اہلکار کو کہا تھا، برطانیہ اور جوں کشمیر کے وہ تاریخی، جغرافیائی اور معاشرتی تعلق نہیں تھا جو پاکستان اور کشمیر کے تھے اور ہیں لیکن مجھے اپنوں سے جو زخم ملے تھے ان کی وجہ سے میں محتاط تھا۔ آج کے نوجوانوں کو بھی میرا مشورہ سے کہ جدوجہد میں دوست احتیاط سے بناؤ اور کسی کی ایسی بات پر یقین نہ کرو جو وہ آپکے سامنے بالکل واضح نہیں خاص کر کی ساتھی کے اخلاص اور اس کی صلاحیت کو جانے بغیر اسے مخلص اور باصلاحیت مت تصور کریں۔ میں نے مخلص لوگ بھی ہمت جرات اور صلاحیت نہ ہونے کے باعث ڈھیر ہوتے دیکھے ہیں۔ کچھ لوگوں کو تحریک میں شامل ہونے کا شوق تو ہوتا ہے لیکن دباؤ پڑھنے پر چھینیں نکل جاتی ہیں۔ ایسا مخلص مگر کمزور ساتھی پوری ٹیم کے لیے نقصان دہ ہوتا ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا، تمام تر تلخ تحریرات کے باوجود میں نے پاکستانی حکام کے لیے کچھ گنجائش رکھی ہوئی تھی لیکن اس وقت میں نے پاکستان کے کسی بھی ادارے کے ساتھ بات چیت کرنے کا ارادہ ترک کر دیا جب برطانوی حکام کی میرے حوالے سے پری اینڈ پوسٹ ریلیز پلان پر پاکستانی حکومت نے بڑی تابعداری سے عمل کیا۔ یہ بات تو قابل فہم ہے کہ جب تک میں برطانوی سیکورٹی کے پاس تھا تب تک پاکستان کا کوئی اختیار نہ تھا لیکن بڑی ہونے کے بعد بھی پاکستان نے وہی کیا جو برطانیہ چاہتا تھا۔ برطانیہ نے میرے واپسی کے فیصلہ کو تو نہیں سمجھ کر آج بھی پاکستانی حکام کے ذریعے کوشش کر رہا ہے کہ میں یہاں ایڈ جسٹ نہ ہو سکوں جسے عام لوگ کبھی نہیں سمجھ پائیں گے کیونکہ ہمارے اکثر لوگوں اور انگریزوں کی سوچ کے لیوں میں بہت فرق ہے۔ انگریزی نظام آج بھی ہمارے ملکوں میں محب وطن اور باصلاحیت افراد کو سیاسی طور پر مضبوط اور پرمومٹ نہیں ہونے دیتا۔ انگریز آج بھی کہتے ہیں کہ انہیں وہ وقت یاد ہے جب اسلامی ریاست کی سرحدیں فرانس تک تھیں اور پہیں مسلمانوں کے قبضے میں تھے۔

۰۰۰

نواں باب

خفیہ اداروں کی نگرانی میں پاکستان سے آزاد کشمیر کی

طرف

میں چھیس سال بعد طعن واپس آ رہا تھا۔ بچپن میں گیا تھا۔ بہت سارے راستے اب میرے لیے نئے تھے۔ ہولاڑپل کے اوپر سے جب سیکورٹی کا نوائے گزرا تو مجھے اندازہ ہوا کہ میں کہاں ہوں۔ کوٹی سے کھویرڑ کی روڈ بھی اب نئی تجھی لیکن مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ کوٹی ہے۔ میں نے اپنے ساتھ بیٹھے انسپکٹر کو کہا کہ ہمارا ایک گھر گاؤں اور ایک شہر میں ہے۔ ڈونگی میرے ماموں زاد بھائی راجہ شیر خان کا میڈیکل سٹور ہے وہاں سے پوچھنا ہو گا کہ ہم کس گھر جائیں۔ سیکورٹی نے شیر راجہ شیر خان کا میڈیکل سٹور ہے وہاں سے پوچھنا ہو گا کہ اندر ہی رہنے کا مشورہ دیا۔ میں نے کہا ڈونگی اپنَا شہر ہے میں باز رکھ لیں گیا۔ اتنے میں شید بیگم ایک خاتون قریبی مکان کی چھت سے بھاگتی ہوئی نیچے آئی۔ انہوں نے شور مچایا: ہمارا قیوم آ گیا۔ ان کے ساتھ چند اور عورتیں بھی تھیں۔ یخوتین والہانہ انداز سے میرے ساتھ لپٹ گئیں۔ میرا اپنا گھر بھی نوکلو میٹر آ گئے تھے۔ ان خواتین کی اس جذباتی ملاقات سے واضح ہو گیا کہ لوگوں کو دور دور تک میری آمد کی خبر تھی اور وہ منتظر تھے۔ سیکورٹی مجھے ایک دوکان کے اندر لے لگئی۔ انسپکٹر نے کہا راجہ صاحب یہی آپکے اپنے لوگ ہیں باقی سب جھوٹ ہے۔ اس مقام پر میں نے سیکورٹی اپنے کار کی لگتی کی۔ جو مجھے نظر آئے وہ بارہ تھے۔ بھائی شیر صاحب کا پوچھا تو پتہ چلا وہ میرے استقبالی قافلہ کے ساتھ اسلام آباد ہوائی اڈہ پر گئے ہوئے ہیں۔ دائیں بائیں بوتلیں آنا شروع ہو گئیں۔ لوگ جمع ہونا شروع ہو گئے اور سیکورٹی پر بیشان ہو گئی۔ چلنے پر اصرار کیا۔ ہمارے ماموں زاد بھائی راجہ عبدالرشید صاحب کے فرزند مر نے سیکورٹی کو کہا وہ اسے فالو کرے۔ مسجدوں کے سپیکرز سے میرے کانوں میں آواز پڑی: راجہ قیوم آ گے۔ اس وقت ابھی موبائل یہاں

نہیں تھے۔ اپنے آبائی شہر کو یہ پہنچا تو وہاں سب کچھ بدلنا ہوا تھا۔ گھر پہنچا تو ہر طرف سے اپنے گھر کی طرف لوگوں کو بھاگتے ہوئے دیکھا۔ عجیب منظر تھا۔ مرد عورتیں بچے بوڑھے سب بھاگے آ رہے تھے۔ سیکورٹی اہلکار شذرہ کے لیکن جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ہو یہ گھر کے ایک بزرگ جا گیر دار راجہ سر صاحب کا جذبہ تھا۔ گرمی کا موسم تھا۔ شاید وہ نصف کلو میٹر دور اپنے گھر آرام کر رہے تھے کہ جب انہوں نے سن تو جس حالت میں تھے جل پڑے۔ جلدی چلنے سے راستے میں ان کی ایک چپل کی بدری ٹوٹ گئی۔ وہ اسے ہاتھ میں پکڑے پیدل پہنچ آئے۔ دوسرا ادمی میرا کلاس فیلور اج افضل المعرفہ دیتے خان تھے۔ ان کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ داڑھی لمبی تھی۔ میں نے کہا یار دیا قیدی میں تھا لیکن لگتا ہے لٹکے تم رہے! دتنے نے ہاتھ کر کے گلے گالیا۔ لوگ جوک در جوک آتے رہے۔ اسلام آباد سے آئے والا سیکورٹی کا نواسے ایک گھنٹہ ہمارے گھر قیام کرنے کے بعد چلنے لگا تو آئی ایس آئی کا ایک سینٹر افسر میرے پاس آ کر بیٹھا۔ کہنے لگا راجہ صاحب یہاں لوگ اپنی سیاست کے لیے آپ کو استعمال کریں گے لیکن آپ کسی جلسے میں نہیں جانا۔ گھر ہی رہنا۔ میں خاموش رہا۔ جب اس نے پھر یہ فرمان دہرا�ا تو میں نے کہا دیکھو۔ مجھے جیل میں کوئی استعمال نہیں کر سکا۔ یہ تو میرا گھر ہے۔ وہ دلائل دینے لگا تو میں نے کہا میں مشرف نہیں ہوں جو امر یکہ کی ایک ہی کال پر ڈھیر ہو گیا تھا۔ میں فریڈم فائزر ہوں۔ ہمارے سامنے میرے والد صاحب کے کزن راجہ محمد شریف خان تشریف فرماتھے۔ خوش لباس بابے کو دیکھ کر آئی ایس آئی کا افسر اٹھا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں مجھے سمجھانے کا مشورہ دے کر مایوسی کی حالت میں چلا گیا۔ مجھے بے شمار نوجوان ملنے لگے جن کے بارے مجھے کئی دن بعد علم ہوا کہ ان میں کچھ میری قید کے دوران پیدا ہونے والے بھائی اور بھتیجی تھے۔ ایک بھائی کا نام ضاروب تھا مگر کچھ لوگ اسے ضاروف بھی کہتے تھے اور میں سوچتا رہا کہ ضاروب اور ضاروف دو مختلف ادمی ہیں۔ اسی طرح قمر اور کامران بھی ایک ہی نوجوان تھا۔ اس طرح کی کئی باتیں سمجھنے کے لیے مجھے وقت لگا۔

راجہ قیوم وہابی ہو گیا!

پاکستانی الیکٹرونک میڈیا کو تو مجھ سے نہ ملنے دیا گیا لیکن انڈن سے بی بی سی انگلش، دوہی سے بی بی سی اردو اور بھارت کے ذی ٹی وی نے بھی پہلے دن میرے انٹرو یوز کیے۔ بی بی سی اردو نے

حریت کا نفرس بارے مجھے پوچھا کہ کیا آپ اس کی پالیسی سے متفق ہیں تو میں نے تحفظات کا اظہار کیا۔ ابتدائی ملاقاتوں کے بعد خاندانی بزرگ مجھے خاندانی قبرستان لے گئے جہاں میں نے اجتماعی فاتح پڑھی۔ چھیس سالوں کے دوران ہونے والی لا تعداد اموات کی ہر گھر جا کر تعزیت کرنا ممکن تھا اس لیے میں ہر گاؤں کے قبرستان میں جا کر دعا مانگتا۔ کچھ لوگوں نے مشہور کر دیا کہ مجھے انگریزوں نے بیل میں وہابی بنادیا۔ شام کو کھویرڑہ والے گھر سے کھجور لہ والے گھر گیا جہاں میں نے جنم لیا تھا۔ وہاں بھی جنم غیر موجود تھا۔ میں نے دیکھا کہ ہمارے گھر کے ٹھن کے سامنے دور رخت ہوا کرتے تھے جن کے نیچے ہم بچپن میں کھیلا کرتے تھے وہ وہاں نہیں تھے۔ سڑک کی تعمیر کی وجہ سے ہمارے گھر کی طرف جانے والا راستہ بھی بدلا ہوا تھا۔ تیس سال کی عمر تک کے کسی بھی رشتہ دار کو میں نہیں پہچان سکتا تھا جبکہ چھیس سال قبل میری پر دیس روائگی کے وقت پچاس سال کے قریب عمر کا کوئی فرد زندہ نہ تھا۔ میں اپنے ہی گھر میں اجنبیوں سے مل رہا تھا لیکن ہر ملنے والے کے چہرے پر خوشی اور محبت کے اثرات تھے۔ فریفٹی کا عالم تھا۔ سب بیگانے اپنے لگ رہے تھے۔ میں نے بہت جلد بہن بھائیوں دوستوں اور رشدہ داروں کے بچے بچپوں کے نام یاد کر لیے۔

پہلے جلسے میں پہلی تقریر

سرکاری اداروں نے جلے کو روکنے کے ہر ممکن کوشش کی۔ سردار سکندر حیات خان کی حکومت تھی۔ آزاد کشمیر حکومت بھی نہیں چاہتی تھی کہ میرا استقبال ہو۔ ان کی روزی روٹی کا معاملہ تھا۔ بس عام لوگوں کی خواکش تھی کہ جلسہ ہو اور قیوم راجہ کے خیالات سنے جائیں۔ شام کو نوجوانوں کی بھاری تعداد میرے پاس آئی اور جلسے کے انتظامات کی تفصیل بتائی۔ میرے ماموںزاد بھائی راجہ یعقوب خان کے فرزند راجہ محمد الیاس خان، کزن مجبوب اکبر اور لمیشن فرنٹ کی مقامی شان سرگرم تھے۔ سترہ ۲۰۰۵ کو میں برطانوی بیل سے نکال کر ہیتھر وائر پورٹ پر لا یا گیا تھا۔ اٹھاراں میں کو اسلام آباد پہنچا اور انہیں کو دوسرے دن صبح دل بجے کے قریب مجھے گھر سے براستہ ڈوگی کھویرڑہ جلسہ گاہ میں لے جایا گیا۔ راستے میں انگلت لوگ استقبال کر رہے تھے۔ مجبوب اکبر میری کار چلا رہے تھے اور الیاس خان عقبی نشست پر تھے۔ کچھ نوجوان مسلح تھے۔ ڈوگی چوک میں پہنچے تو الیاس خان نے کار سے باڑ نکل کر کہا انکل ایک منٹ کے لیے باڑ تشریف لا دیں۔ باڑ نکلا تو بھوم سے امان اللہ خان برآمد ہوئے۔

وہ ائر پورٹ پر بھی گئے تھے لیکن ایجنسیوں نے ملنے نہ دیا۔ راولپنڈی اور اسلام آباد سے بھارتی مقبوضہ کشمیر کے کافی لوگ بھی ائر پورٹ پر گئے تھے۔ امان اللہ خان بڑے جذباتی ہو گے۔ گلے ملے اور میرے ماتھے کو چوما۔ اس دوران کچھ ٹرینیگ پولیس والے بھی آگے بڑھے اور مجھ سے مصافحہ کیا۔ راستے میں ہجوم اتنا تھا کہ مجھے کوئی سمجھنیں آ رہی تھی کہ میں کہاں ہوں۔ امان اللہ خان بھی الیاس خان کے ساتھ پچھلی نشست پر بیٹھ گے۔ میں چار دن لگا تاریوکے سے پاکستان تک ایجنسیوں کے زرنخ میں رہنے کی وجہ سے تکا ہوا تھا جس کی وجہ سے امان اللہ خان سے سلام دعا کے علاوہ کوئی بات نہ کر سکا تو انہوں نے سوچا میں اب بھی مہاترے قتل کیس کی اس انکواری کی وجہ سے ناراض ہوں جکا میں نے مطالبہ اور امان اللہ خان نے مخالفت کی تھی۔ پاکستانی اداروں اور آزاد کشمیر حکومت کی مخالفت کے باوجود جلے میں بھاری تعداد موجود تھی۔ اس تقریب میں بھی صدارت کا سوال کھڑا ہوا۔ لبریشن فرنٹ کی خواش تھی کہ امان اللہ خان صدارت کریں جبکہ میرا موقف تھا کہ جن لوگوں نے ہماری رہائی کی مہم چلانی ان میں سے کسی کو صدارت کی دعوت دی جائے۔ میں جانتا ہوں کہ لبریشن فرنٹ کے بے شمار مخلص ساتھیوں کو افسوس ہوا کہ لبریشن فرنٹ کے عہدیداروں کو سُٹھ کی زینت بننے کا موقع نہ ملا لیکن میں اپنے اخلاقی اصولوں کے سامنے بیب بس تھا۔ ۲۲ سالہ اسیری کے دوران جس کا جور و یہ رہا اسکا مجھے علم تھا کہ لبریشن فرنٹ کے مقامی نوجوانوں کو۔ مجیب اکبر اور الیاس خان پر ایک طرف سے لبریشن فرنٹ کا دباؤ تھا کہ سُٹھ ان کے حوالے کیا جائے دوسری طرف میرے اخلاقی اصول تھے۔ جن لوگوں نے سیاسی والیتگیوں سے بالاتر ہو کر میری رہائی کی طویل جدوجہد کی انہیں چھوڑ کر میں کیسے سیاسی مصلحت کا شکار ہو سکتا تھا۔ الیاس خان اور مجیب اکبر نے داشمندی کا مظاہرہ کر کے ہمارے خاندان کی معمر شخصیت راجہ محمد شریف خان صاحب کو صدارت کی دعوت دے کر درمیانی راستہ نکال لیا۔ راجہ محمد شریف صاحب نے اپنے صدارتی خطبہ میں میرے والد راجہ مولود الدخان مرحوم کا نام لیتے ہوئے کہا کہ انہیں لگتا ہے کہ آج ان کے بھائی راجہ مولود الدخان کے گھر ایک اور بچے نے جنم لیا۔ امان اللہ خان نے مجھ سے پہلے تقریر کی۔ انہوں نے اپنی تقریر میں مجھے ملنے والی عزت کو سنبھال کر کھنے کے علاوہ کچھ اور مشورے بھی دیے لیکن میں نے صرف ان لوگوں کا شکریہ ادا کیا جنہوں نے میری اور ریاض کی رہائی کے لیے عملی جدوجہد کی تھی۔ مجھے معلوم ہے کہ لبریشن فرنٹ کے مقامی کارکنوں کو اسکا دکھ ہوا لیکن ان کو مطمئن کرنے کے لیے اگر میں اپنی ۲۲ سالہ اسیری کے دوران قیادت کے

رویوں کا ذکر کرتا تو اور یہ واضح کرتا کہ کس طرح مقبول بٹ کی رہائی کی ہماری کوشش کونا کام کیا اور پھر میری طرف سے جماعت کے اندر انکوئری کی درخواست کو دبایا گیا تو انہیں اور ماہی ہوتی۔ قبر سے تو کبھی کوئی واپس نہیں آیا لیکن جس قبر سے میں ۲۲ سال بعد نکل کر آیا تھا اس میں جن رویوں کا مجھے سامنا رہا ان سے وہ سارے لوگ واقف تھے جنہوں نے اس مشکل گھری میں میراست ہدایا تھا۔ اس لیے میں نے نتوکسی کی ضرورت سے زیادہ تعریف کی اور نہ تقدیم۔ میں نے درگزرسے کام لیا مگر یہاں کچھ لوگوں کی خواش تھی کہ انہیں پیک اور لبریشن فرنٹ کے کارکنوں کے سامنے سرخو کرنے کے لیے سچ کی زینت بنایا جائے اور تعریفوں کے پل باندھے جائیں۔ میں یہ منافقت نہ کر سکا جس کی کچھ لوگوں کو تکلیف ہوئی اور آج تک ہے۔ بد قسمتی سے جس جماعت کو ہم اپنی جوانیوں کی قیمت پر برطانیہ میں بینڈ ہونے سے بچایا وہ عہدوں کی خاطر دھڑے بندیوں کا شکار ہو گئی۔ ہر دھڑا مجھے اپنے دھڑے میں شامل ہونے کی دعوت دیتا ہے لیکن میں نے واضح کہا کہ ہماری قربانیدھڑے بندیوں نہیں تحریک کے لیے ہے۔ پھر بھی ثبت سرگرمیوں میں ہم شرکت کر لیتے ہیں۔

ذاتی اصولی فیصلوں کا میر اسیا سی نقاصان

شادی انسان کا انتہائی ذاتی فیصلہ ہوتا ہے۔ یہاں یہ فیصلہ بھی انسان کو خود آزادانہ طور پر نہیں کرنے دیا جاتا۔ جب میں بڑی ہو کر آیا تو یوں لگا جیسے یہاں لوگوں کی سب سے بڑی دلچسپی میری شادی ہے۔ میں ابھی اچھی طرع وطن کی آب ہوا اور پانی کا عادی نہیں ہوا تھا کہ ہر کوئی میری شادی بارے مجھ سے سوال کرتا تھا۔ کب ہو گی کہاں سے ہو گی؟ جس کسی کے گھر میں جاتا لوگ بھی سوچتے بس شادی کی ہی بات ہو رہی ہو گی۔ میں بہت تنگ پڑ گیا۔ دل کرتا تھا کہ میں دور تھا میں جا کر مراقبہ کروں۔ تنگ آ کر گاؤں سے کھوئی رہ والے مکان میں چلا گیا۔ گرمی کا موسم تھا۔ بجلی بار بار چلی جاتی تو میں مکان کے ایک ایسے عقبی کمرے میں چلا جاتا جس کی چھت پر لینٹر نہیں لکڑی تھی جس کی وجہ سے اس کمرے میں گرمی کم تھی۔ طویل عرصہ برطانیہ جیل سیل میں رہنے کی وجہ سے دوسرے لوگوں کی نسبت گرمی کے اثرات سے زیادہ متاثر ہوتا تھا۔ گرد و نواح کے کچھ لوگ اس کمرے میں بھی پہنچ جاتے جس میں میں چھپنے کی کوشش کرتا تھا۔ سوال پھر وہی۔۔۔ شادی؟ ہمارے گھر میں پاکستان کی ایک فیملی کرایہ پر رہتی تھی تو میں نے ان کو کہا کہ میں گرمی کی وجہ سے اس کمرے میں پناہ لیتا ہوں آپ

یہاں بھی لوگوں کو لے آتے ہیں۔ کافی عرصہ بعد کچھ افراد نے مجھے بتایا کہ اس فیلمی کی ایک خاتون بعض خواتین کو میرے ساتھ رشتہ کروانے کے لائق میں پیسے لیا کرتی تھی۔ اس طرح کی جتنا سے گریز کرنے کے تیجے میں انہوں نے چہ میگوئیاں شروع کر دیں کہ جیل نے میری مردانہ قوت ختم کر دی ہے ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جیل میں اتنا عرصہ رہنے والا جوان ادمی عورتوں سے دور بھاگے۔ یہ شبہ اس وقت دور ہوا جب میں نے شادی کی اور میرے گھر ایک بچی نے جنم لیا۔

اس میں کوئی بٹک نہیں کہ کچھ دوست اور رشتہ دار مخلصانہ طور پر میری شادی کی کوششیں کرتے تھے لیکن مجھے ابھی یہ فیصلہ کرنے کے لیے وقت درکار تھا۔ ایک بند دنیا میں آزاد دنیا میں منتقلی کے اثرات وہی سمجھ سکتا ہے جو اس تجربہ سے گزرا ہوا۔ کچھ سیاسی ہمدردانہ کی تجویز تھی کہ میں اسلام آباد سے شادی کروں اور وہاں ہی قیام کروں۔ وہاں سیاسی و مالی فوائد تو بہت تھے لیکن میں نے سوچا کہ میں بچپن میں خاندان سے جدا ہوا۔ جوانی جیل کی نذر ہو گئی۔ اب شادی کر کے اگر اسلام آباد رہوں گا تو ایک بار پھر خاندان سے جدا ہو جاؤ نگا۔ آہستہ آہستہ اندازہ ہوا کہ یہاں ایسے فوائد کے لیے تو کچھ لوگ دین و دنیا بھی چھور دیتے ہیں جبکہ میرا اپنا خاندان بھی میرے جذبوں کا صحیح ادراک نہ کر سکا کیونکہ انہیں اس جذباتی کیفیت کا تجربہ نہیں تھا جس میں میں بتلا تھا۔ بحال میں نے شادی ایک متوسط مذہبی گھرانے سے کی۔ سرالی خاندان کے ساتھ ہمارا پہلے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ شادی اسلامی اقدار کو سامنے رکھ کر کی گئی۔ میری اہلیہ ڈبل ایم اے ہے۔ شادی کے وقت وہ ابھی زیر تعلیم اور بے روزگار تھی جبکہ دوسرا گھر انوں کی خواتین گزٹیڈ افیسر تھیں اور ان کے والدین معاشرے کے بااثر لوگ تھے۔ زندگی کو صرف پیسے کی نظر سے دیکھنے والوں کے نزدیک میرا فیصلہ غلط تھا۔ بحال شادی کے بعد میں نے اہلیہ کو ایک سرکاری گرلز سکول میں بطور معلمہ تعینات کروادیا۔ وزیر تعلیم اور ان کے حواریوں نے اپنا بندہ بھرتی کرنے کے لیے ڈٹ کر مخالفت کی لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات میرے ساتھ تھی۔ تعیناتی کے وقت پلندری سے تعلق رکھنے والی ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسرز ہرہ یا سمین اور نیلم سے تعلق رکھنے والے ڈویژن ڈائریکٹر اشرف صاحب اور میر پور ضلع کے مفتی اولیں صاحب میرے حق میں کھڑے ہو گئے۔ ٹیسٹ انٹرویو میں وہی لسٹ منظور کی جاتی ہے جو وزیر فائل کر کے پینل کو دے گئے یہاں مظفر آباد سے بیاہ کر کے کوٹی آنے والی ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسرز نیلم فیروز راجہ نے سیاسی مداخلت کو ناکام بنایا کہ میری اہلیہ کو مستقل کروادیا۔ نیلم فیروز راجہ نے کئی بار بطور ڈسٹرکٹ

اسیکیشن افسروزیروں کے خلاف سینڈ لیا بلوچ کے منظر طاہر اور ارجمند صداد کے ساتھ ہونے والے تکروں کا مجھے ذاتی طور پر علم ہے۔ طاہر کو انہوں نے ہائی کورٹ میں شکست دی تھی۔ میری شادی کیم جنوری ۲۰۰۶ کو ہوئی تھی۔ دنیا جہاں سے پیاری میری تین بیٹیاں ہیں، میری بڑی بیٹی مونہہ کئی تقریری مقابله جیت چکی ہے۔ میڑک سائنس میں ۱۱۰۰ میں سے ۱۰۳۰ نمبرات لے کر اپنے کالج میں اول پوزیشن حاصل کی جکی بارہ سال آئینہ ساتوں کلاس میں اور سب سے چھوٹی گیارہ سال کی سلوویہ چھٹی کلاس کے ساتھ ساتھ حفظ بھی کر رہی ہے۔ پانچ سال کا بیٹا برہان ۲۰۱۳ میں ایک افسوسناک حادثے میں فوت ہو گیا تھا۔ اس پر میں نے ایک کتاب بعنوان چھوٹی زندگی بڑی کہانی لکھی تھی۔ دکتو پیچھا نہیں چھوڑتے لیکن زندگی روای دوال ہے۔ اللہ تعالیٰ جہاں انسان کو ازاں مانش میں ڈالتا ہے وہ صبر و استقامت کا صلہ بھی دیتا ہے۔ انسان کو صرف اس ذات پاک کی نعمتوں کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ کچھ لوگ سیاسی قربانی کا صلہ سیاسی منصب سمجھتے ہیں لیکن یہ غلط سوچ ہے۔ سیاسی تعبدیاری کر کے منصب کسی کو بھی مل سکتا ہے لیکن عزت و وقار صرف اصولوں اور انسانی خدمات کے صلے میں ملتا ہے۔ منصب وقت ہوتا ہے اور عزت دامنی بشرطیکہ انسان اس کو سنبھال کر رکھے۔ میں رہائی کے بعد جس بھی ملک میں گیا وہاں تعارف کے بعد مجھے ہر خاص و عام نے عزت دی، خاصکر ترکی اور ایران میں جہاں آج بھی مختلف شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے ترک اور ایرانیوں کے ساتھ میرے روابط قائم ہیں۔ وہاں کے انگریزی اخبارات میں مضا میں شائع ہوتے ہیں جبکہ ان کی قومی زبان میں شائع ہونے والے اخبارات کے لیے میں اپنے ترک اور ایرانی دوستوں سے ترجمہ کرو کر پہنچ دیتا ہوں۔ روں کے کچھ تحقیقی ادارے بھی تجزیے مانگتے رہتے ہیں

۰۰۰

دسوال باب

قومی و بین الاقوامی خطابات اور اصلاحات

استقبالیہ ریلی میں پہلے خطاب کے بعد ہر طرف سے دعوتیں ملنا شروع ہو گئیں لیکن ہمارے غیر روادارہ اور فرقہ وار انہ سیاسی مزاج نے بہت مشکلات پیدا کیں۔ میں اس مزاج سے ناواقف تھا۔ میرے لیے ہر کوئی قابل احترام تھا۔ میرے اندر سیاسی اور قبیلائی تعصبات نہیں تھا مگر یہاں جب بھی مجھے کسی ایک سیاسی و مذہبی جماعت کی طرف سے دعوت ملتی تو ان کی مخالف پارٹیاں مجھے ان کی دعوت قبول کرنے سے انکار کرنے کا مشورہ دیتیں۔ میں جیل کے تلخ ماحول میں بھی غیر جانبداری کے ثبت سیاسی و قانونی متانج دیکھا تھا جس کی وجہ سے مجھے ہر نگ نسل اور مذہب کے سیاسی اور غیر سیاسی لوگوں کا تعاون حاصل ہوا تھا۔ دوسرا میں سوچتا تھا کہ میں ۲۲ سال طویل قید کے بعد اگر مشکل وقت کے ساتھیوں کے بجائے آج سیاسی مفادات کی خاطر موقع پرستوں کے مشورے پر چلو گا تو مجھ جیسا کم ظرف کوئی نہ ہوگا۔ یہاں پر سیاسی لوگوں کو اس اصول سے کوئی عرض نہ تھی۔ کچھ تو ایسے بھی تھے کہ جو مجھے مشورہ دیتے کہ اب آپکو اپنا حق لینے کے لیے کسی بڑی جماعت میں شامل ہو جانا چاہیے۔ بڑی جماعت سے مراد غیر ریاستی انتخابی پارٹیاں تھیں۔ راجپتوں کی بھاری اکثریت مسلم کافرنز میں تھی۔ بے شمار لوگ چاہتے تھے کہ میں مسلم کافرنز میں شامل ہو جاؤں اور راجہ شار صاحب کو آرام کرنے کا مشورہ دیا جائے لیکن میں نے کہا میں نے لوگوں کے ذاتی سیاسی مفادات پورے کرنے کے لیے طویل قید نہیں کاٹی۔ راجپتوں کی اکثریت مجھ سے ناراض ہو گئی۔ انہوں نے مجھے اپنی دنیا کا ادنی قرار دے کر نظر انداز کرنا شروع کر دیا لیکن دنیا نے مجھے نظر انداز نہیں کیا۔ فرق

صرف یہ ہے کہ کچھ لوگ یہاں کچھ لوگوں کی شناخت عہدے اور مناصب ہیں جبکہ اصل شناخت کردار ہے۔ مختلف ملتیہ فکر کے لوگوں نے مجھے دعویٰں دینا شروع کر دیں۔ آبائی شہر کھوئی رڑ کے بعد مجھے کوٹی بار، ڈویال بار، لاہور بار، میر پور بار، مظفر آباد یونیورسٹی اور کوٹی یونیورسٹی میں خطاب کا موقع ملا۔ کوٹی بار میں اس وقت بار کے صدر چوہدری عبدالسلام ایڈوکیٹ، ڈویال میں معروف مرزا ایڈوکیٹ، اور لاہور میں فاروق حیدر کی حکومت میں ایڈیشنل ایڈوکیٹ جزل رہنے والے راجو سیم یونس صاحب اور اس وقت بولٹن برطانیہ میں کنسلر حاصل علی خرم نے دعنوں کا اہتمام کیا جبکہ مظفر آباد میں شعبہ کشمیریات کے اس وقت کے انچارج خواجہ شفیق صاحب اور کوٹی یونیورسٹی میں سفارتکاری پر خطاب کا اہتمام وہاں کی ڈین ساجد مشتاق صاحب نے کیا تھا۔

راجو سیم یونس صاحب میر پور آئے تو ایک بار پھر مجھے بار میں خطاب کی دعوت دی۔ ان کا خاندان بھی تقسیم کشمیر کا شکار ہوا۔ وہ انتہائی جرأتمند، صاف گو اور خوش مزاج شخصیت کے مالک انسان ہیں۔ لاہور بار میں کشمیری وکلاء کو خطرہ تھا کہ سردار عبدالقیوم صاحب جیسے الحاق پاکستان کے داعی کے خطاب پر بھی لاہوری آپ سے باہر ہو گئے تھے جبکہ راجہ قیوم تو ہے ہی خود مختار کا حامی تو گڑھ بڑھ کا زیادہ اندریشہ تھا لیکن سب اچھا رہا۔ لاہور میں اس وقت میرے ایک عزیز آئی ٹی انجنینیر محمود علی اور بھارتی مقبوضہ کشمیر سے تعلق رکھنے والے جانب جسٹس بخاری، سابق رکن اسمبلی شفیق جو ش صاحب کے علاوہ اور بھی متعدد سیاسی و سماجی شخصیات تھیں جنہوں نے دو مرتبہ لاہور میں خطاب کی دعوت دی۔ یہاں سامعین نے مجھ سے اتفاق کیا کہ الحاق کا راستہ ریاست کی وحدت نہیں مکمل تقسیم کی طرف جانے والا راستہ ہے اور جوں کشمیر کے آزادانہ بیانیہ کے بغیر مسئلہ کشمیر تا قیامت پاک۔ ہند علاقوائی بھگڑا کے طور پر جاری رہے گا اور ریاستی عوام کا خون بہتار ہے گا لہذ کشمیر یوں کو مختلف اپشتر پر وقت ضائع کرنے کے بجائے تمام غیر ملکی افواج کے اخلاع کے مطالبہ پر متفق ہو جانا چاہیے۔ پاکستان کے متعدد انشور اور سفارتکار بھی اب اس حقیقت کو تسلیم کرنے لگے ہیں۔ حال ہی میں بھارت میں پاکستان کے سابق ہائی کمشٹر اور حرمی میں سفیر ہنے والے عبد الباطن صاحب نے بھی افواج کے اخلاع کو مسئلہ کے حل کی شرط قرار دیا۔ پاکستان کے کئی سابق جریل بھی اس حقیقت کو تسلیم کر چکے ہیں لیکن افواج کے اخلاع سے بھی پہلے جو شرط ہے وہ آر پار کی ریاستی قیادت کا مشترکہ بیانیہ ہے جس کے بغیر پیش رفت ممکن نہیں۔

میرے علمی خطابات میں استنبول یونیورسٹی میں دو مرتبہ اور ایران یونیورسٹی میں ایک خطاب اور انشوروں کے اجلاسوں سے خطاب اور ایرانی پارلیمنٹر بیز سے متعدد ملاقاتیں شامل ہیں۔

رہائی کے بعد اصلاحی کام

میرا موقف ہے کہ اگر تعلیمی نظام درست ہو جائے تو تمام ادارے درست ہو سکتے ہیں کیونکہ ہر ادارے کا ہر فرد تعلیمی نظام کی پیداوار ہے۔ اس لیے میں نے ۲۰۰۶ء میں اس وقت کے ڈپٹی کمشنر بشیر مغل سے اجازت لے کر ایک تحقیقی رپورٹ میں جو سفارشات پیش کیں ان میں قومی زبان میں قومی نصاب اور بچوں کی کردار سازی پر توجہ کی درخواست کی۔ اسی دوران مجھے علم ہوا کہ نصاب سے مطالعہ جموں کشمیر زکال دیا گیا تھا۔ اس کی وجہ جاننے کے لیے میں نے حکومت کو خط لکھا تو جواب ملنا صاب پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ تیار کرتا ہے جس پر میں نے جموں کشمیر ٹیکسٹ بک بورڈ کے قیام کی درخواست دی۔ انکاری پر میں نے ہائی کورٹ میں رٹ کر دی تو حکومت نے جموں کشمیر ٹیکسٹ بک بورڈ کے بجائے اسیبلی بل کے تحت آزاد کشمیر ٹیکسٹ بک بورڈ قائم کیا مگر یہ بھی آزادانہ طور پر کام کرنے کے بجائے مخصوص اداروں کے تابع ہے گویا کہ آزاد کشمیر کا کوئی ادارہ آزاد نہیں ہے۔ حکمکے پولیس میں اصلاحات کے لیے آئی جی پولیس اور متعدد ڈی آئی چیز سے خط و کتابت اور ملاقاتیں ہوئیں۔ پولیس کے مطابق عدیہ بیماری کی اصل جڑ ہے۔ پولیس کہتی ہے کہ اس کا کام ہے کیس تیار کرنا مگر وکلاء اور جگہ سالہا سال کیسوس کو لیکاۓ رکھتے ہیں۔ عدیہ میں بے شمار باصلاحیت اور انصاف پسند جموں کو شکوہ ہے اور بجا ہے کہ ہائی کورٹ کے جموں کی تعیناتی سیاسی بنیادوں پر ہوتی ہے جس کی وجہ سے اچھے جموں کی ترقی ایک مقام پر آ کر رک جاتی ہے۔ جب سینئر ججز سیاسی ہونگے تو ما تخت جموں کے مصافانہ فیصلے بھی مشکل ہو جاتے ہیں۔ آزاد کشمیر میں شاید ہی کوئی ایسا سیاستدان ہو گا جس نے میراث کی بنیاد پر کوئی مقام و منصب پایا ہو۔ اس لیے جس طرح وہ خود خوشنامدی ہیں اسی طرح کے خوشنامدی وہ ہر ادارے میں بھرتی کرتے ہیں۔ آزاد کشمیر کی سیاست دن بدن تنزلی کا شکار ہے۔ مسقبل قریب میں اس کی بہتری کے کوئی آثار نہیں لیکن اصلاحات پسندوں کو اپنی جدوجہد جاری رکھنی ہوگی۔

سفارتی جدوجہد

رہائی کے بعد میں نے سیاسی سرگرمیوں سے زیادہ سفارتی محاذ پر توجہ دی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ یہاں پر سیاسی جدوجہد سے مراد آئے روز جلے اور جلوس ہیں جن سے چہرے تو متعارف ہوتے ہیں لیکن نتائج کم نکلتے ہیں۔ دوسرا سفارتی شعبہ ہماری تحریک میں بری طرح نظر انداز ہوا تو میں نے اس پر توجہ دینا ضروری سمجھا۔ سفارتی جدوجہد میں پبلسٹی سے اجتناب بہتر ہتا ہے۔ میں کئی سال متعدد سفارتکاروں سے ملتا رہا مگر کبھی خبر نہ لکھی۔ ایک بار دو دوستوں کے اصرار پر انہیں ساتھ لے گیا تو میں ابھی اسلام آباد ہی تھا کہ آئی بی کا انسپکٹر کوٹلی میرے وکیل دوستوں کو پوچھ رہا تھا کہ کیا میں روس نواز نہیں ہو گیا؟ دوستوں نے وجہ پوچھی تو انسپکٹر نے کہا کہ راجہ صاحب آج کل لیبیاً اور سینٹرل ایشیا کے سفروں سے ملاقا تیں کرتے ہیں۔ مسلمانوں کی قسمتی ہے کہ ان کے حکمران خود اپنی یونین مضبوط کر کے روئی فیڈریشن اور یورپی یونین کی طرح ایک طاقتور بلاک کھڑا کرنے کے بجائے ایک دوسرے پر امریکہ نوازی اور روس نوازی کے الزامات لگاتے رہتے ہیں۔ کل میں چانتا پاؤ اس کا تجزیہ پڑھ رہا تھا کہ چینی وزیر خارج روں کے قریب ہونے کے باوجود امریکہ کے ساتھ کچھ معاملات پر بہتر ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سنجیدہ قوموں کے نزدیک مسائل کے حل کے حصول کے لیے ایک دوسرے سے جب مقابلہ کرتی ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ اپنے نظریات اور روایات سے مستبردار ہو کر دوسرے کے یہیں میں چلائی گئی ہیں۔ ہماری ابھی سے جموں کشمیر کو سوٹر لینڈ کی طرح ایک نیوٹرل ریاست کے طور پر اجاگر کرنا چاہیے۔ اس لیے ہمیں اپنے نظریات پر قائم رہتے ہوئے ہر کسی کے ساتھ تعلق قائم کرنا چاہیے لیکن پاکستانی حکومت کی ہمیشہ کوشش ہوتی ہے کہ کشمیری براہ راست دنیا کے ساتھ اگنج نہ ہوں جبکہ بھارت تو مکمل طور پر جموں کشمیر کو اپنا حصہ تصور کرتا ہے۔ بحال جن دوستوں کو میں ساتھ لے کر سفروں کو پاس گیا تھا ان میں جب سیاسی و سفارتی جدوجہد کے درمیان فرق رکھ کر پبلسٹی سے اجتناب کرنے کی حس نہ دیکھی تو میں اس کے بعد کبھی کسی سیاسی ادمی کو ساتھ لے کر نہیں گیا۔ پبلسٹی ہمارے لوگوں کی بہت بڑی کمزوری ہے۔ اب تک میں درجنوں مسلم اور غیر مسلم سفارتکاروں سے مل چکا ہوں۔ سب سے زیادہ میں امریکی،

ایرانی اور کرمل قذافی کے عہد کے سفارتکاروں سے متاثر ہوا۔ جس ملک میں یہ تعینات ہوتے ہیں اس ملک کی اے بی اے سے یہ واقع ہوتے ہیں جبکہ معلومات عامہ کے بھی یہ مائر ہیں۔ معلومات امریکہ کے بڑے کامیاب ہتھیاروں میں سے ایک ہے۔ وہ الہیت اور صلاحیت کے اعتبار سے کسی کو اپنے برابر نہیں سمجھتے اور اس میں کوئی شک بھی نہیں۔ ایک دفعہ میں نے ایک امریکی خاتون سفارتکار کے ساتھ جرمن قوم کے تدبیر اور انتظامی امور کی تعریف کی تو وہ بر امانتاً گئی اور فوراً بولی: جی ہاں ایشیا کے معیار کے مطابق ہیں گا لیکن ہمارے معیار اس سے بلند ہے۔

کرمل قذافی چونکہ ایک انقلابی سوچ کے لیڈر تھے۔ اس لیے دوسرے ملکوں کے اندر ورنی حالات سے انہیں دچپسی تھی۔ ان کے سفارتکار پیشہ ور تھے۔ 2009ء میں اقوام متحده کی جزوی اسمبلی میں کشمیر پر کرمل قذافی کے خطاب سے قبل میں پانچ بار لیبیا کے سفیر سے مل چکا تھا لیکن میں نے کبھی ان ملاقاتوں کی خبر نہیں لگائی۔ کرمل قذافی کے خطاب کے چند ہفتے بعد لیبیا کے سفیر نے مجھے فون کر کے سفارت خانے میں بلا یا تو اقوام متحده میں اپنے لیڈر کے خطاب کا کتابی ترجمہ مجھے دیا۔ اس کے بعد بھی ملاقاتیں جاری رہیں۔ لیبیا کے سفیر نے مجھے لیبیا کے دورے کے لیے پانچ رکنی وفد تیار کرنے کے لیے کہا۔ ایک ادنی میں نے برطانیہ سے شامل کیا۔ لسٹ لیبیا جا چکی تھی کہ کرمل قذافی شہید کر دیے گے۔ ایران ایک تاریخی نظریاتی ملک ہے۔ اسے اپنی ثقافت پر فخر ہے۔ وہ دوسرے ممالک میں صرف سیاسی و اقتصادی تعلقات ہی نہیں بلکہ معاشرتی تعلقات پر بھی توجہ دیتا ہے۔ ایران نے عوامی سفارتکاری کے لیے خانہ فرہنگ کے نام سے ایک الگ سفارتی شعبہ قائم کر رکھا ہے جس کے تحت وہ اپنی تاریخ، ثقافت اور زبان کو پھیلانے کے ساتھ ساتھ پیپلز ٹو پیپلز لنک پر بھی کام کرتا ہے۔ ایران کے سفارت خانہ نے متعدد بار مجھے اپنے پروگراموں میں دعوییں دیں اور جہاں میر اخطاب بتا تھا وہاں خطاب کی دعوت بھی دی۔ اس دوران بھی مجھے یہ تجربہ ہوا کہ پاکستان پسند نہیں کرتا کہ کوئی بھی کشمیری براہ راست کسی غیر ملکی ادارہ سے بات کرے۔ یہ کشمیریوں کا ایک ایسا خود ساختہ کیل ہے جو کشمیریوں کو بولنے کی اجازت کیا رائے تک نہیں لیتا۔ ہر جگہ اور ہر دفعہ اپنی مرضی مسلط کر کے مسئلہ کشمیر کو بگاڑا اور لٹکایا۔ ایرانی سفارت خانے کے پروگراموں میں موجود پاکستانی میڈیا نے میرے خطاب کو مکمل طور نظر نظر انداز کیا لیکن ایرانی میڈیا نے ہمیشہ میری تقریر کا پورا متن شائع کیا۔

ادبی کام

تحریر تقریر اور تحلیل میرا پر انداشتہ ہے۔ میں نے یورپ میں اپنا یہ شوق پورا کیا مگر جوانی میں ہی گرفتار ہو گیا جس کی وجہ سے آگے بڑھنے کا سلسلہ رک گیا۔ جیل کے اندر پہلے تو کسی فرد سے ملتا ہی مشکل تھا لیکن انگریز بڑے داشتمد ہیں۔ وہ قیدیوں کو مختلف سرگرمیوں میں ملوث رک کر کشڑوں کرتے ہیں۔ اس کے لیے انہیں متحرك قیدیوں کا تعاون درکار ہوتا ہے۔ ہمیں بھی اپنی جیل کی تلخ زندگی کو قابل برداشت بنانے کی ضرورت تھی۔ آہستہ آہستہ اعتماد بحال ہوا تو جیل گورنر نے مجھ کہا کہ چونکہ آپ نفیات کا کورس کرتے ہیں۔ جیل میں پکھڑ پریشن کے شکار قیدی ہیں جن کی آپ کو نسلنگ کریں۔ گورنر نے مجھے ایک آئی ڈی جاری کی جو میں گلے میں ڈال کر دوسرا بار کوں میں جب جاتا تو سیکورٹی گیٹ کھول دیتی اور معین دفتر میں ڈپریشن کے شکار قیدیوں کے ساتھ ملاقاتی کرواتی۔ اتنے میں امام اللہ خان کی جہد مسلسل کی پہلی جلد مجھ ملی جس میں انہوں نے لکھا کہ راجہ قیوم ڈپریشن کا شکار شکی مزاج نوجوان ہے جس نے افسر دگی کا شکار ہوا کر مجھ پر مہارتے کے انداز کو سبوتاش کرنے کے حوالے سے جھوٹے الزامات لگائے۔ میں بہت گدگدایا کہ جیل گورنر میری نفیاتی خدمات لے رہا ہے اور قائد تحریک اپنے ساتھی کو نفیاتی مریض قرار دے رہے ہیں۔ جیل میں میری اس طرح کی خدمات بالآخر جیل کے اندر میٹھل ہیلٹھ کافرنس پر منصب ہوئی۔ کافرنس کے دو سیشن تھے۔ ایک صبح اور ایک سہ پہر۔ مجھے دونوں سیشن کی صدارت کے لیے باڑ سے دو شخصیات کو دعوت کی اجازت دی گئی تو میں نے ایک افراد کریں خاتون اور لینڈن میں مقیم کشمیری بہومن راؤں کوںسل کے سربراہ ڈاکٹر سید نذیر گیلانی کو دعوت دے دی۔ مقررین میں محدث صحبت کے مختلف ماڑیں تھے۔ کچھ ہندوستانیوں کو بھی ہم نے دعوت دی۔ چونکہ کھانے کا بھی جیل حکام نے انتظام کیا تھا۔ جیل میں گوشت تمام قیدیوں کے لیے ایک مسلمان قصاب سے آتا تھا تو میں نے ہندوستانیوں کو لکھا کہ اگر وہ گوشت کھانا پسند نہ کریں تو ہم ان کے لیے سبزی تیار کروالیں گے۔ میں نے محسوس کیا کہ بھارتیوں کو میری یہ بات بہت پسند آئی اور مہارتے کی وجہ سے ان کے رویے میں نرمی آگئی۔ اس دوران ایک بھارتی خاتون نے کہا کہ وہ داستان گو ہے۔ تہائی کے شکار لوگوں کو داستان گوئی کے زریعے ریکارڈ کرتی ہے۔ اگر میں گورنر سے

بات کروں تو وہ ہفتے میں ایک بار جیل میں آ کر قیدیوں کی ڈپریشن کم کرنے میں مدد کیا کرے گی۔
گورنر نے منظوری دے دی تو فین بھی کافی عرصہ چلتا رہا۔

معاشرتی قدر و پر لیکھر

جیل گورنر نے مجھے ایک اور پیش کش کی۔ وہ ٹریننگ سٹاف کو آئھنی سٹی پر لیکھر تھا۔ ہر اتوار کی صبح ۹ بجے ایک گھنٹہ میں یہ لیکھر دیتا جس کا ایک توصیفی لیٹر آج بھی میرے پاس موجود ہے۔ ایک پیش سٹاف ہفتے میں دو مرتبہ معذور بچوں کو پڑھانے کی خدمات سر انجام دیتا تو یہاں بھی مجھے دو پیر یڈل گے۔ ان خدمات کے پیش نظر مجھے کمپیوٹر تک رسائی حاصل ہو گئی جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں ہر دوسرے تیرے دن اخبارات کو آرٹیکل بھیج دیتا۔ جیل نے بھی حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ پالیسی بنائی کہ میں اپنی رہائی کے لیے حکومت کے خلاف لکھتا ہوں سوکھنے دو۔ ہمارا اس میں کیا نقصان ہے۔ ہوم آفس نے جب روکنے کی کوشش کی تو میں نے نجح کو لکھا کہ ایک طرف ہوم منٹر عدالت کو باپی پاس کرتا ہے تو دوسرا مجھے اس پر بولنے کی اجازت بھی نہیں دیتا۔ نجح نے کہا تمہیں اظہار رائے اور اپنے دفاع کا حق ہے۔ اب تو میرے پاس لکھنے کا سار ٹیفیکیٹ ہو گیا تھا۔ سو خوب لکھا اور آخر دم تک لکھا۔ بری ہونے کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ اندر وون ویرون ملک انگلش اردو دونوں زبانوں میں میرے کالم چھپتے ہیں۔ ترکی ایران عراق اور گلگت کے سفر نامے بھی لکھے ہیں جبکہ اردو انگلش میں متعدد کتابوں کے علاوہ کچھ دوسرے مصنفوں کی کتابوں کے ترجمے بھی کیے ہیں۔ ایران میں مسلسل میرے مضمایں شائع ہوتے ہیں

گیارہواں باب

مہاترے کیس میں گرفتار شدگان کا اختیار اور کردار

جن لوگوں نے مہاترے کو انگو کیا ان میں سے صدیق بھٹی کے علاوہ قاتل سمیت سارے ہمیں کوئی اشارہ دیے بغیر خود پاکستان بھاگ گئے تھے اور ہماری رہائی کے لیے کسی قسم کا کوئی سیاسی و قانونی قدم نہیں اٹھایا۔ ہماری رہائی کی مہم ان لوگوں نے شروع کی جنکے ساتھ گرفتاری سے قبل ہماری کوئی شناسائی نہ تھی۔ انہوں نے صرف قومی اور انسانی جذبے کے تحت ہماری مدد کی۔ ہمارے پاس بھی بے شمار اپشنز تھے جن میں سے ایک اپشن یہ تھا کہ جب انگو کا حساب و عدہ واپس نہ آئے تو ہم بھی کھسک جاتے لیکن ریاض اور میں نے اسے بزدلی سمجھ کر حالات کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اسی وجہ سے جب برطانیہ کو قاتلوں کی واپسی میں ناکامی ہوئی تو بھی ہمارے پاس استغاثت کی یہ تجویز تسلیم کر لینے کا اختیار تھا کہ چھیر میں امام اللہ خان اور سید کڑی جزل زیر انصاری بھی ملوث تھے بلکہ نج نے ایک موقع پر سماحت روک کر میرے بیر سڑ لا رڈ گفورد کو کہا کہ تم اپنے موکل کو بتاؤ کہ اگر اس نے نج نہ بتایا تو وہ ایک طویل عرصہ کے لیے جیل بھیج دیا جائے گا۔ مجھے کہہ رہے میں واپس لا کر سماحت دوبارہ شروع کی تو نج بر سٹو نے مجھے پوچھا: مسٹر راج آپ نے اپنا دفاع کرنا ہے یا دوسروں کا؟ میں نے درمیانی راستہ اختیار کرتے ہوئے کہا میں صرف اپنے خلاف الزامات کا جواب دوں گا۔ مجھے یہ بھی کہا گیا کہ مہاترے کے قتل کے پیچھے ایک پاکستانی ایجنسی کا ہاتھ ہے۔ یہ سن کر دو باقی میرے ذہن میں آئیں۔ ایک یہ کہ ہماری خالص تحریک کو داغدار کرنے کے لیے اسے پاکستان کی تحریک کارنگ دینے کی کوشش کی جا رہی

ہے کیونکہ اب تک مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ برطانیہ نہیں چاہتا کہ کشمیریوں کی اپنی تحریک ہو کیونکہ وہ اسے ہندوستان اور پاکستان کا علاقائی جھگڑا ہی ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ دوسری بات یہ تھی کہ گنگا ہائی جیلینگ کی طرح مہارتے کیس کو بھی غلط رنگ دے کر کوئی خاص مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ بحال کشمیر لبریشن ارمی نے زیر انصاری سے ہی ثالثی کے حوالے سے رابطہ کیا تھا جبکہ امان اللدھان از خود ثالث بن گئے تھے اور اسی بنا پر پولیس انہیں اور ہاشم قریشی کو پکڑ کر تھانے لے گئی تھی۔ دنیا بھر کا میڈیا ایم راک روڈ میں قائم لبریشن فرنٹ کے دفتر پر جمع ہو گیا تھا جہاں سیکٹری جنرل کی حیثیت سے زیر انصاری موجود تھے۔ امان اللدھان کو یہ بات پسند نہ تھی کہ زیر انصاری توجہ کا مرکز بنے جس کی وجہ سے انہوں نے از خود پولیس اور بھارتی ہائی کمیشن کو ثالث کے طور پر پیش کر دیا مگر انہیں ثالث قول کرنے کے بجائے پولیس سٹیشن بند کر دیا گیا جو پورے پلان کی ناکامی کا نتیجہ آغاز ثابت ہوا۔ دوسری طرف زیر انصاری نے ملنے والی شہرت سے استفادہ کرنے اور یورپ میں جماعت کو لیڈ کرنے کے بجائے آزاد کشمیر میں جا کر گنای اختیار کر لی۔ ہم سب نے اپنے بیانات میں کہا کہ وہ ملوث نہیں ہیں لیکن پھر بھی وہ خائف ہو کر درکی ٹھوکریں کھاتے رہے اور موقع پرست گنام لوگ آگے آ کر جماعت پر چھاگے۔ اصل میں امان اللدھان نے کبھی بھی باصلاحیت کار کنوں پر مشتمل ٹیکنیکیں بنائی۔ ہمیں گرفتار کر کے ایک ایسی پوزیشن میں ڈال دیا گیا کہ ہم نے اب اپنے اور جماعت کے دفاع کے درمیان فیصلہ کرنا تھا۔ ہم نے جماعت کو بچانے کا فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ ہم نے اپنے خمیر سے پوچھ کر کیا۔ وہاں مشورہ لینے دینے کا تواب ماحول ہی نہیں رہا تھا۔

آج چالیس سال بعد بھی میں سمجھتا ہوں کہ گرفتاری کی صورت میں اپنی جماعت اور ساتھیوں کو بچانا جماعت کے ہر کارکن کا فرض ہے اور ہم گرفتار شدگان نے یہ فرض دیانتداری سے ادا کیا۔ لیکن جو ہمارے سٹینڈ کی وجہ سے آزاد رہے انہوں نے اپنا فرض پورا نہیں کیا۔ پھر بھی ریاض نے اپنی بیس اور میں نے اپنی رہائی کی ۲۲ سالہ سیاسی و قانونی جنگ کے دوران کسی بھی مقام پر کپرو مائز نہیں کیا۔ ہمارا موقف تھا کہ جس نے جو غلطی کی ہے اسکا جماعت کے اندر احتساب ہونا چاہیے لیکن ان کی گرفتاری کے لیے پولیس سے تعاون ہمارے نزدیک درست عمل نہیں تھا۔ ہم آخوند تک اس اصول پر قائم رہے۔ جب میں نے جماعت کے اندر انکو اتری کی درخواست کی تو میرے خلاف منفی پروپیگنڈا شروع کر دیا گیا کہ جی یا ب جماعت کے خلاف ہو گیا۔ پھر بھی میں نے صبر کیا لیکن جس

انداز سے آج بھی نوجوان نسل کو گراہ کیا جا رہا ہے اور جھوٹے افسانے بنائے جا رہے ہیں ان کی وجہ سے میں بھی اپنا حق اور اختیار استعمال کرتے ہوئے نوجوان نسل کو اصل حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ کسی بھی جماعت، تحریک اور قوم کی اس وقت تباہی شروع ہو جاتی ہے جب احتساب کا مطالبہ کرنے والوں کو غلط اور غلط کارروں کا دفاع شروع کر دیا جائے۔

جب میں بری ہو کر آیا تو مجاز رائے شماری کے باñی جناب عبدالخالق انصاری صاحب اور لبریشن فرنٹ برطانیہ کے پہلے صدر عبدالجبار بٹ صاحب نے میر پور انصاری صاحب کی رہائش گاہ پر مجھے ایک روپرٹ دکھائی جسے وہ اپنا کارنامہ قرار دے رہے تھے۔ مجھ سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے دونوں بزرگوں نے کہا کہ اس روپرٹ میں انہوں نے واضح کر دیا کہ مہاترے کے قاتل ہی اصل میں مقبول بٹ کے قاتل ہیں۔ میں نے پوچھا جناب بتایے مہاترے کا قاتل کون ہے؟ دونوں بزرگ رہنماؤں نے یک زبان کہا امان اللہ خان جس نے قتل کا حکم دیا۔ انصاری صاحب کے ساتھ نشست میں کسی نے ساتھ یہ لفہ بھی دیا کہ امان اللہ خان نے امریکہ میں بیٹھ کر سرینگر یونیورسٹی کے واس چانسلر مشیر الحق کے قتل کے حکم کا بھی اعلان کر کے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ لوگ ان کے کہنے پر قتل بھی کر دیتے ہیں۔ پھر محفل میں تھقہ بھی لگا البتہ عبدالخالق انصاری صاحب سنجیدہ رہے۔ پوری گفتگو سننے کے بعد میں نے عبدالخالق انصاری صاحب سے مخاطب ہو کر کہا جناب آپ ہمارے بزرگ ہیں۔ نظر یہ خود مختار کے باñی ہیں۔ اس روپرٹ کی بازگشت میں نے پہلے بھی سن تھی لیکن آپ کے احترام کے پیش نظر میں نے پریس میں اس پر تبصرہ کرنے کے بجائے مناسب سمجھا کہ اگر زندگی میں موقع ملا تو بالمشافہ بات کروں گا۔ آج وہ موقع ملا تو میں کہونا کہ کہ اس روپرٹ میں تو آپ نے امان اللہ خان کے بجائے ہم پر مقبول بٹ کے قاتل ہونے کا الزام لگایا ہے۔ انصاری صاحب نے چونک کرتہ دید کی اور مجھے روپرٹ کی متعلقہ سطور دو بارہ دکھائیں۔ میں نے کہا جناب انصاری صاحب آپ نے اس روپرٹ میں کسی کا نام نہیں لیا بلکہ یہ کہا جو مہاترے کے قاتل ہیں وہی مقبول بٹ کے قاتل ہیں۔ مہاترے قتل کیس میں سزا تو ہم نے کائی ہے لہذا آپ کی روپرٹ جو دیکھے گا وہ تو یہی سمجھے گا کہ آپ ہم پر الزام پر لگا رہے ہیں۔ انصاری صاحب نے کرسی پر ٹیک لگاتے ہوئے کہا ہاں یہ بہت بڑی غلطی ہے۔ روپرٹ میں ہمیں نام لکھنا چاہیے تھا۔ مہاترے کیس میں اپنے کردار کیوضاحت کی ایک وجہ تو اس طرح کی روپرٹیں ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ہر سال مقبول بٹ شہید کی برسی قریب آتی

ہے تو یہ بحث شروع ہو جاتی ہے کہ مہاترے کے کوکس نے قتل کیا اور کروایا۔ بار بار ہمارا نام مہاترے کے قاتلوں میں لیا جاتا ہے لیکن اس دور کی قیادت میں سے اکثر لوگ چشم پوشی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس حقیقت کو واضح نہیں کیا جاتا کہ جن نوجوانوں نے سزا نئیں کالی ہیں انہوں نے جماعت کو بچایا مہاترے کو قتل نہیں کیا جس کی وجہ سے آجکلی نوجوان نسل ہمارے بارے میں گمراہی کا شکار ہوتی ہے۔ ہم نے دیکھا کہ اس طویل عرصے میں ہماری موجودگی میں کسی کو ہمارا سیاسی دفاع کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ ہم مر جائیں گے تو کون کرے گا؟ اس لیے ضروری ہے کہ میں قوم کو حقیقت بتاؤں اور احسان مندوں اور احسان فراموشوں کے درمیان فرق بھی واضح کر دوں۔

احسان مندا اور احسان فراموش دوست

کوئی کتنا ہی عقلمند، چالاک اور تحریکار کیوں نہ ہو، اسے دوسراے انسان کی فطرت، نیت اور کردار کا اس وقت تک پہنچنے نہیں چلتا جب تک آپ اس کے ساتھ معاملات نہیں کرتے۔ مجموعی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ معاملات کے اصولوں پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ آپ کسی کے ساتھ سفر کریں یا کھانا کھائیں تو پھر اسکو سمجھیں گے۔ ہماری تنظیم کی سب سے بڑی بد نصیبی یہ ہی ہے کہ اس میں لوگوں کو کسی ازمائشی اور تربیتی عمل سے گزارے بغیر شامل کیا جاتا رہا بلکہ بے شمار لوگ حادثوں کی پیداوار ہیں جس نے ہماری تحریک کو بہت نقصان پہنچایا۔ میں 1981 کے وسط میں بریشن فرنٹ میں شامل ہوا۔ اس وقت میں جرمی میں تھا۔ اسی سال فرانس کا دورہ کر کے وہاں لبریشن فرنٹ قائم کی۔ جولائی 1983 میں امان اللہ خان کی دعوت پر لوٹن میں منعقدہ شہداء کے شیمر کافرنٹ میں شرکت کے لیے انگلینڈ گیا۔ پہلی بار لبریشن فرنٹ برطانیہ کی اکثریت سے ملاقات ہوئی۔ تین فروری 1984 کو مہاترے انگلستان کے لیے پیرس رہتا تھا اور مہاترے میں ملوث سارے افراد انگلینڈ رہتے تھے جس کی وجہ سے میں یوکے کے اکثر کارکنوں کی صلاحیتوں اور تحریبوں سے ناقص تھا۔ ہمارا پریس بعض اوقات لوگوں کے عمل کے بجائے ان کے دعووں کی تشریف کر کے انہیں فرضی لیڈر بنادیتا ہے۔ انتخابی پارٹیوں میں تو زیادہ تر ہیں ہی فرضی لیڈر جو پیسے کے بل بوتے پر زندہ ہیں لبریشن فرنٹ میں بھی فرضی لیڈروں کی کمی نہیں جس کی وجہ سبب نظریہ تو بہت پھیلا مگر غیر نظریاتی لوگوں نے اس میں گھس کر تنظیم کو بار بار تورڑا۔ لبریشن فرنٹ کا یہ بھی المیہ ہے کہ آج تک کسی کا احتساب نہیں کیا

گیا۔ ہمیشہ مٹی پاؤ کی ریت پر عمل کیا گیا جس کی وجہ سے جرامم کی حوصلہ افزائی ہوتی رہی اور صرف ذاتی اختلافات کی بناء پر جماعت دھڑے بندیوں کو شکار ہوتی رہی۔ مہاترے کیس میں ایک دوسرت پسندوں کے علاوہ باقی سب افراد ملخص تھے۔ میں پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ کس طرح مہاترے کو پلان کے برکس قتل کیا گیا جس کی میں نے انکو ائمہ کا مطالبہ کیا۔ ایک صدیق بھٹی کے علاوہ گولی مارنے والے سیاست سارے اخواء کندگان برطانیہ سے فرار ہو گئے تھے۔ اب برطانیہ اور بھارت کا تمام تر مشترکہ دباؤ ریاض، صدیق اور مجھ پر تھا۔ ہم تینوں نے جو پالیسی اختیار کی اسی کے بل یو تے پر لبریشن فرنٹ کی باقی قیادت گرفتار ہونے ہونے سے پچی اور اس پر غیر قانونی قرار دیے جانے کا خطرہ ملا۔ ہم نے کبھی لیڈری کا دعویٰ تو نہیں کیا لیکن مشکل وقت میں لیڈر شپ کے معیار پر اتر کر اور قربانی دے کو پوری جماعت کو چایا اور حریت پسندی کی لاج رکھی۔ یہ دو چاروں کی بات نہیں۔ ۲۲ سال کا طویل قصہ ہے جس کے دوران اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو استقامت بخشی اس کے لیے ہم اپنے خالق و مالک کے شکر گزار ہیں۔ اس استقامت کے بد لے جو عزت ملی وہی ہماری زندگی کا انشا ہے گو کہ بعض مقامات پر امان اللہ خان نے اعتراف کیا کہ اگر سب سے پہلے گرفتار ہونے والا قیوم راجہ سٹینڈن نہ لیتا تو ساری قیادت گرفتار ہو جاتی اور جماعت برطانیہ میں بینڈ ہو جاتی جو بھارت کی سب سے بڑی خواش و کوشش تھی لیکن افسوس یہ ہے کہ جب بھی کسی نے امان اللہ خان سے پوچھا کہ مہاترے کو قتل کیوں کروایا تو انہوں نے الزام ہم پر ڈال دیا کہ نوجوانوں نے مس ہینڈل کیا بجکہ مس ہینڈل نگ تب ہوئی جب پلان کے برکس امان اللہ خان نے خود بھارتی سفیر اور برطانوی پولیس کو غیر ضروری فون کر کے ٹاشی کی پیش کردی جہاں سے معاملات بگڑ گے۔ یہ واضح احسان فراموشی ہے۔

مہاترے کے قاتل کا اب بھی نام کیوں نہیں لے رہا؟

میں جب بڑی ہو کر گھر پہنچا تو چند دن بعد مہاترے کو گولی مارنے والا مجھے رات کی تاریکی میں آ کر ملا۔ سب سے پہلے اس نے مہاترے کو گولی مارنے کی غلطی کا اعتراف کر کے مجھ سے معدrust کی۔ اس نے کہا وہ کم عمر اور ناجربہ کا رہا اور اس کے جذبے سے غلط کام لیا گیا۔ اس نے اعتراف کیا کہ امان اللہ خان کے مشورے پر اس سے یہ غلطی سرزد ہوئی۔ یہ حقائق قوم کی امانت سمجھ کر پس ڈلم کیے جا رہے ہیں تاکہ نوجوان نسل ان سے سیکھ کر بہتر فیصلے کرے نہ کہ ہمیں کسی کی دل آزاری یا

نار انگی مول لینے کا شوق ہے۔ گولی مارنے والے نے کہا اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا لیکن اس وقت کی قیادت کے رویوں سے نالاں ہو کر مہاترے واقعہ کے ایک سال بعد وہ جماعت سے الگ ہو گیا تھا۔ اس نوجوان کو احساس ہو گیا تھا کہ اس کی غلطی کی وجہ سے ریاض ملک اور میں مشکل میں بنتا ہو گئے تھے۔ اس کی ندامت کی میں کئی مثالیں دے سکتا ہوں لیکن ایک مثال یہ ہے کہ اس نے کبھی بھبھی مہاترے اشو پر خود کو صحیح ثابت کرنے کے لیے دوسروں کو غلط نہیں کہا۔ اس نے اپنی غلطی تسلیم کر کے ہمیشہ خاموشی اختیار کھلی۔ میرے ساتھ قید کاٹنے والے ریاض ملک کے بھائی اظہر ملک اس کار کے ڈرائیور تھے جس میں مہاترے کو انخواہ کیا گیا تھا۔ اظہر ملک 2020 میں اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ اللہ ان کے درجات بلند کرے انہوں نے مہاترے کیس کے بعد ساری زندگی اکیلے کوٹلی بسر کی جبکہ بیوی بچے اور والدین برطانیہ میں تھے۔ میرے والدوں میں نوسال کا تھا جب فوت ہو گئے تھے جبکہ والدہ اپنے آبائی وطن میں تھیں مگر ریاض اور اظہر ملک کے والدین نے میرا بھی اپنے بچوں کی طرح خیال رکھا۔ وہ بھی دنیا سے چل بے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی بھی مغفرت فرمائے۔ اظہر ملک تاحیات لبریشن فرنٹ کے ساتھ وابستہ رہے۔ انہوں نے بھی ہمیشہ بردباری اور اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کیا لیکن جس ادمی نے سب سے بڑی بزدلی، حماقت اور بے وقاری کی اسے آج بھی اپنی کوئی غلطی نظر نہیں آتی۔ اگر وہ اپنی غلطی تسلیم نہ بھی کرے تو کوئی منسلک نہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ یہ احسان فراموشی کر کے ہر وقت ان لوگوں کے خلاف زہر اگلتا رہتا ہے جن کا اسے شکریہ ادا کرنا چاہیے یا ان لوگوں کے خلاف تخریب کرتا ہے جو حسب توفیق کوئی نہ کوئی ثبت کام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ڈیال جمنڈ اکیس میں گرفتار تنور احمد اور سفیر احمد کی رہائی کے لیے ایک کمیٹی بنی تو یہ اس کمیٹی کے خلاف معاونین کی حوصلہ شکنی کرنا شروع ہو گیا۔ یہ لکھ سکتا ہے نہ پڑھ سکتا ہے۔ صرف بول سکتا ہے اور جب بھی بولتا ہے تو غلط بیانی اور تخریب کاری کرتا ہے۔ چند دن قبل پروفیسر عظمت خان کی طرف سے ڈس ایپ گروپ میں اٹھائے گئے ایک نکتہ پر تبصرہ کرتے ہوئے اس نے کہا کہ پہلے انسان کو علم حاصل کرنا چاہیے پھر بات کرنی چاہیے جبکہ خود یہ ساری زندگی برطانیہ میں سکول نہیں گیا۔ امان اللہ خان صاحب نے جہاں کچھ اچھے کام کیے وہاں نقصان دہ فیصلوں کی فہرست بھی طویل ہے۔ ایک جرم یہ بھی کیا کہ انہوں نے ہمیشہ ناخواندہ لوگوں کو پر و موت کیا تاکہ وہ خود اپنے فیصلوں میں آزاد رہیں۔ اسلام مرزا عبدالخالق انصاری صاحب کا عزیز ہے لیکن یہ خود کو ان سے بھی بڑا دانا تصور کرتا ہے۔ امان

اللہ خان نے بھی خالق انصاری صاحب کے ساتھ اختلاف کی وجہ سے ان کے چند عزیزوں کو سیاسی بنیادوں پر اپنے ساتھ ملا�ا جن میں ایک اسلام مرزا تھا۔

مہاترے کواغوا کر کے صد ایق بھٹی کے مکان میں چھوڑ کر چند دوسرے لوگوں کے ساتھ یہ پاکستان بھاگ گیا۔ میں سال روپوش رہا۔ اس دوران مجھ سے سیت گرفتار ہونے والے ساتھیوں کی کوئی مدد کرنے کے بجائے کہتا رہا جی ان کی کیا قربانی ہے وہ تو ویسے ہی پھنس گئے تھے۔ جب انسان پھنس جائے تو قید کاٹنی ہی پڑتی ہے۔

جناب قارئین کرام، کسی کواغوا کرنا یا گولی مار دینا بہادری نہیں۔ بہادری صبر و استقامت کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرتے اور پرکشش پیشکشوں کو ٹھکراتے ہوئے اپنے مشن کو جاری رکھنے کا نام ہے۔ لیڈر شپ کا مطلب سیاسی بیانات نہیں بلکہ سیاسی معاملات کو سنبھالنے، سلیمانی اور تنظیم و تحریک اور قوم و ملک کو کسی بڑے نقصان سے بچانے کا نام ہے۔ ہمیں فخر اور خوشی ہے کہ ہم نے مشکل وقت میں اپنی جماعت کو بچایا۔ تسلیم کرنے والے کرتے ہیں جو نہیں کرتے وہ صرف اپنا ظرف ظاہر کرتے ہیں۔ اسلام مرزا کو جب مہاترے قتل کے بیس سال بعد امریکہ سے گرفتار کر کے واپس برطانیہ لا یا گیا تو یورپی انسانی حقوق کی عدالت میری رہائی کا فیصلہ دے چکی تھی۔ برطانوی حکومت نے موقف اختیار کیا کہ جب تک اسلام مرزا کا ٹرائل نہیں ہو جاتا تب تک قیوم راجہ کو بری نہ کیا جائے۔ پولیس بار بار اسلام مرزا کے حوالے سے میرا بیان لینے جیل میں جاتی رہی۔ پہلے میں نے زبانی انکار کیا مگر جب زیادہ تنگ کیا گیا تو میں نے اپنے حق میں فیصلہ دینے والی انسانی حقوق کی یورپی عدالت سے تحریری شکایت کی کہ بڑش پولیس مجھے بلیک میل کر رہی ہے۔ میں نے اسلام مرزا کے ایک رشدہ دار جو بفضل خدا آج بھی زندہ ہیں کو جیل میں بلا کر کہا کہ اسلام مرزا کو کہہ دو وہ خود خاموش رہے میں کوئی بیان نہیں دوں گا۔ اگر وہ خاموش رہا تو اسے کچھ نہیں ہو گا اور ایسا ہی ہوا۔ میں فروری میں بری ہونے والا تھا اور اسلام مرزا کی وجہ سے تین ماہ مزید جیل میں رہا۔ پھر بھی اس ادمی کی احسان فراموشی کی یہ انتہا ہے کہ یہ میرے خلاف منفی پروپیگنڈا کرتا رہتا ہے جس کی واحد وجہ یہ ہے کہ میں نے مہاترے کیس کی انکوارری کا مطالبہ کیا تھا جس سے کچھ چہروں کو بے ناقاب ہونے کا خطہ تھا جس میں ایک یہ خود ہے۔ 1984 میں جو ہوا سو ہوا لیکن حد یہ ہے کہ ایک سال قبل ایک ٹس گروپ نے ایک بار پھر مقبول بٹ شہید کی برستی کے موقع پر مہاترے کا قتل اور قیوم راجہ کی گرفتاری کے موضوع پر بحث

شروع کر دی۔ میں نے اس بحث میں حصہ لینے سے اجتناب کیا لیکن جب مجھ سے براہ راست رابطہ کیا گیا تو میں نے کہا کہ میں اپنی گرفتاری کی کہانی بہت دفعہ بیان کر چکا ہوں۔ آئے روز میں اس طرح کی بحث میں حصہ نہیں لینا چاہتا لیکن اسلام مرزا جو میری گرفتاری کے وقت ہزاروں میل دور آزاد کشمیر بھاگ گیا تھا اس نے کہا کہ قیوم راجہ اپنی غلطی سے گرفتار ہوا کیونکہ اس کے پاس دوران سفر ایک ہی وقت میں دو پاسپورٹ تھے۔ ایک اپنا اور ایک اسحاق کے نام کا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ میر اپنا پاسپورٹ تھا ہی ہوم آفس میں اور مہاترے پلان سبوتاً ٹکے جانے کی وجہ سے میں مشکل میں پھنس گیا تھا۔ یہ پاسپورٹ پولیس نے ہوم آفس سے لے کر عدالت میں پیش کیا تھا جبکہ اسلام مرزا اور امان اللہ خان کہتے رہے کہ میں دو پاسپورٹ پاس ہونے کی وجہ سے گرفتار ہوا۔ میں نے جماعت کی سینٹرل کمیٹی سے درخواست کی تھی کہ جماعت کے اندر اچھے برے کی تمیز اور آئندہ غلطیوں کو روکنے کے لیے جماعت کے اندر خفیہ انکوائری کی جائے ورنہ اگر قیادت کو گرفتار کروانا ہوتا تو پولیس کو چھوٹا سا بیان دینے کی ضرورت تھی۔

اب ہر خاص و عام کے اس سوال کا جواب کہ میں بری ہو کر وطن واپس آجائے کے باوجود مہاترے کے قاتل کو بے ناقاب کیوں نہیں کرتا؟ قوم کو یہ جاننے کا حق ہے لیکن ہر ادنی تباہ سے اگاہ نہیں۔ پہلی بات یہ ہے میں سے پوچھ کہ انہوں نے مہاترے کو قتل کرنے کا حکم کیوں جاری کیا۔ اس پر جماعت اور قوم نے کیا کر لیا؟ کیا اس دھرتی میں آج تک کسی مجرم کا احتساب ہوا ہے؟ یہاں گلے پھاڑ پھاڑ کر حسب ضرورت نئے خطابات سے نواز کر مفاد پرستانہ سیاست کی جاتی ہے۔ چار ہزار مرلیع میل والے اس خطے میں قاہد ملت، ریس الاحرار، مجاہد اول، قائد حریت اور اب قائد تحریک سے کون واقف نہیں۔ ان کے ریاست دشمن جرام کی کسی نے کیا سزا دی۔ ہمارے لوگوں میں صرف تجویز ہوتا ہے ورنہ کسی کا احتساب کرنے کا یہاں رواج ہی نہیں۔ قوم کی اکثریت ایک چینر ٹنگ کلاس ہے جس کے پاس فضول گوئی کے لیے تو بہت وقت ہے مگر ثابت کام کے لیے نہیں۔ اگر کسی نے کچھ کرنا ہوتا تو میں نے سن پچاسی میں ہی جیل سے کہہ دیا تھا کہ عدالت میں تو ہم نے امان اللہ خان کا تحریک تنظیم اور کشمیریت کی لاج رکھنے کے لیے دفاع کیا لیکن جماعت ان سے پوچھ کہ اگر مہاترے کو انداز کرنے کا مقصد مقبول بٹ کر رہائی کی کوشش تھی تو انہوں نے گفت و شنید شروع ہونے سے پہلے ہی اسے قتل کیوں کروایا؟ قاتل نے بھی سینٹرل سا تھیوں کو اس حقیقت سے اگاہ کر دیا تھا مگر نتیجہ سب کے

سامنے ہے۔ اس صورت حال میں قاتل کو بے نقاب کرنے سے اس کا مطالبہ کرنے والے کیا کر لیں گے؟ اگر کچھ ہو گا تو صرف یہ ہو گا کہ برطانیہ اور بھارت اسے گرفتار کروالیں گے جس کا ہمیں، ہماری تحریک اور قوم کو کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ اکثر لوگوں کو علم نہیں کہ مہاترے کیس کی فائل آج بھی کھلی ہوئی ہے۔ برطانیہ آج بھی مہاترے کے قاتل کی تلاش میں ہے اور بھارت کا مسلسل برطانیہ پر داؤ ہے۔ قاتل کی گرفتاری سے ہماری تحریک کو تو کوئی فائدہ نہیں ہو گا لیکن بھارت اور برطانیہ ضرور شادیا نے بجا سئیں گے۔ پاکستان کے سابق امر جزل مشرف نے جب اپنے کئی شہریوں سمیت افغانستان کے سفیر کو امریکہ کے حوالے کیا تو برطانیہ کو ایک بار پھر امید ہوئی کہ مشرف مہاترے کے قاتل کی گرفتاری کے سلسلے میں شاید تعاون کرے۔ برطانیہ نے جب مشرف سے رابطہ کیا تو چونکہ میں مہاترے کیس کا آخری اسیر تھا، برطانوی پولیس میرے پاس گئی اور کہا کہ جزل مشرف کا کہنا ہے کہ قیوم راجہ اگر مہاترے کی نشان دہی کرے تو وہ اس کی تلاش میں معاونت کریں گے۔ میں اگر بیان دے دیتا تو مشرف برطانیہ کی خواش پوری کر کے اپنے دفاع میں یہی کہتا کہ کشمیری خود ایک دوسرے کے خلاف غداری کریں تو میں کیا کروں؟ جو لوگ مجھ سے قاتل کو بے نقاب کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں وہ مجھے بتائیں کہ اگر مہاترے کا قاتل میرے بیان کے نتیجے میں گرفتار ہو جاتا ہے تو قوم مجھے تمغہ دے گی یا غدار کہئے گی؟

برطانیہ کے کچھ اصولوں کا میں اعتراف کرتا ہوں۔ وہ جب مستقبل میں قوم و قیادت کی رہنمائی کے لیے رپورٹ تیار کرتے ہیں تو اپنے دشمن یا مخالف بارے بھی جھوٹ بولنے کے بجائے انسان کی اصل فطرت اور کردار بیان کرتے ہیں تاکہ مستقبل کے فیصلے متاثر نہ ہوں۔ اس کی دو مشاہیں دونوں گا۔ میں نے مہاترے کی انگوڑی کے وقت پولیس سے نہ تعاون کیا اور نہ عدالت میں اقبال جرم کیا جس پر حکومت وقت اور اس کی عدالت مجھ سخت خفا تھا لیکن مہاترے کیس کی ساعت کرنے والے نجح نے اپنے تحریری ریمارکس میں لکھا کہ جن کشمیریوں نے اقبال جرم کیا ان کا اصل مقصد صرف اپنے آپ کو بچانا تھا جبکہ راجنے اس لیے اقبال جرم نہیں کیا کہ اس کے ذہن میں صرف اور صرف قومی کاز تھا۔ دوسری مثال خان ولی خان کی کتاب بعنوان حقائق حقائق ہیں۔ اس میں لکھتے ہیں کہ جب یہ کتاب لکھنے کی خاطر انڈن جا کر لاسبریری سے انڈیا ریکارڈ دیکھا تو اس میں برطانیہ کے کٹر مخالف باچا خان کے اصولوں کی تعریف تھی جبکہ نہرو بھارت میں تعینات انگریزوں کے مطابق خود غرض اور موقع

پرست آدمی تھا جس کے ساتھ انہوں نے معاملات کیے اور مسلم لیگ والوں کی اکثریت بے وقت لوگوں پر مشتمل تھی۔

جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے!

برطانیہ کی پولیس دنیا کی کامیاب ترین پولیس فورس میں اپنا شمار کرتی ہے لیکن جھوٹ اتنا طاقتور نہیں ہوتا کہ وہ زیادہ دیر چھپا رہے یا کسی کا دفاع کر سکے۔ جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بھی عدالتی بیان کا حوالہ دیا تھا، ساعت شروع ہوئی تو استغاشہ نے ایگزیکٹیو کی ایک کاپی میرے سامنے، ایک نجح کے سامنے اور ایک اپنے ہاتھ میں رکھی۔ ایگزیکٹیو لسٹ پر ان تمام اشیاء اور کاغذات کی تفصیل ہوتی ہے جو ملزم کے خلاف عدالت میں پیش کی جاتی ہیں۔ استغاشہ نے مجھے گرفتاری کے وقت میرے جسم سے اتار کر ضبط کیے جانے والے کپڑوں کا ایگزیکٹیو نمبر دیکھنے کو کہا۔ جب میں نے دیکھا تو اس نے اپنے ہاتھ سے فضا میں لیبارٹری کی روپرٹ اہمترتے ہوئے کہا ممبر آف دیجوری اور مائی لارڈ (دوران ساعت کراون کورٹ میں جیوری کے بارہ ارکین اور ایک نجح ہوتا ہے) یہ ہے مسٹر راجہ کے ان کپڑوں کے معائنے کی لیبارٹری روپرٹ جس میں لکھا گیا کہ مسٹر راجہ کے کپڑوں سے مہاترے کے کپڑوں کا فائزہ ملا ہے۔ اس جدید دور میں اگر یہ معلوم کرنا ہو کہ آیا کسی دو افراد کے درمیان کوئی جسمانی رانطہ ہوا ہے تو دونوں کے کپڑوں کو لیبارٹری میں لے جا کر معلوم کیا جاسکتا ہے۔ میں نے نجح سے مخاطب ہو کر پوچھا کہ کیا میں یہ روپرٹ دیکھ سکتا ہوں۔ نجح نے اثبات میں سرہلا یا تو استغاشہ نے نہ چاہتے ہوئے بھی وہ روپرٹ مجھے دی۔ میں اس وقت ٹنس بکس میں کھڑا تھا۔ مجھ پر جراح ہو رہی تھی۔ قدرت نے میرا ساتھ دیا۔ جوں ہی میں نے روپرٹ پر نظر ڈالی تو دیکھا اس کی تاریخ اجراء پولیس کی اس روپرٹ سے ایک ہفتہ بعد کی تھی جس روپرٹ میں پولیس نے میرے ۲۳ فروری کے انٹرویو میں مجھے جھوٹا ثابت کرنے کے لیے کہا تھا کہ اسے میرے کپڑوں کے ساتھ مہاترے کا فائزہ ملا تھا۔ ۲۲ فروری کی رات کو میں ہولی ھیڈ کی اس بندرگاہ پر گرفتار ہوا تھا جہاں انگلینڈ اور آئرلینڈ کی سرحد ملتی ہے۔ میں نے نجح سے مخاطب ہو کر کہا کہ نجح صاحب جس وقت پولیس نے میرے اور مہاترے کے کپڑوں کے ملáp کا مجھ پر الزام لگایا اس وقت تو میں ابھی ہولی ھیڈ بندرگاہ پر ہی تھا جہاں سے میرے کپڑے ابھی بر منگم لیبارٹری میں بھیجے ہی نہیں گئے تھے۔ لہذا پولیس کو لیبارٹری

ٹیسٹ سے پہلے ہی نتیجہ کیسے معلوم ہو گیا؟ ایک لمحہ کے لیے عدالت میں خاموشی چھا گئی۔ ساعت میں وقوع کا اعلان کر دیا گیا۔ ایک بجے کی خبروں میں بی بی سی کی رپورٹر اب عہد و نہضت جو عدالت میں موجود تھی اس نے "Wrong Man Charged With Murder" (غلط ادمی پر قتل کا مقدمہ) کے عنوان سے خبر لشکر کی۔ اس کے بعد بے چاری رابعہ پر بھی عدالت میں داخلے پر پابندی لگا دی گئی۔ بی بی سی نے ہمارے خلاف تو کوئی خبر لشکر کی لیکن حق میں بھی مزید کچھ نہ کہنے دیا گیا۔ ایک اخبار نے البتہ تین صحافیوں پر مشتمل ایک ٹیم سے اس سوال پر تحقیق کروائی کہ برطانیہ اور فرانس کے تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کرنے والے طلباء اس خطرناک راستے پر کیوں چل لکے۔ رپورٹ کا لب ولباب یہ تھا کہ اس کی وجہ ان کے اندر اپنے ٹلنٹ شیر کے ساتھ پائے جانے والی نا انصافی کا احساس تھا لیکن انگریزی کی ایک کہاوت ہے کہ اگر بادشاہ ہی آپکے خلاف ہو تو آپ انصاف کس سے مانگیں گے!

ہمارا معاشرہ اتنا بنا بھج بھی نہیں:

گرفتاری کے شروع میں کافی مسائل تھے لیکن جب لوگ مجھے مانا شروع ہوئے تو انہیں میری مجبوری کا اندازہ ہونے لگا بڑے بھائی نذیر راجح صاحب کے علاوہ بے شمار ایسے کشمیری بھی مجھے جیل میں پیسے بھیجنے لگے جن کا ہماری تنظیم سے تعلق نہ تھا۔ رقم اتنی زیاد تونہ تھی کہ میں خیراتی وکیلوں سے جان چھڑا پاتا لیکن جیل کے اندر باعزت زندگی گزارنے کے لیے کافی تھی۔ رہائی کے وقت برطانوی کشمیر کمیونٹی کے کچھ احباب نے مجھے بیس لاکھ کے قریب رقم جمع کر دی جو واپسی پر شادی اور کار پر لگ گئی۔ لوگ مجھے پوچھنے لگے کہ پاکستان مقبوضہ کشمیر بھیجنے والے مجاہدوں کو پیسے دیتا ہے کیا مجھے بھی کچھ ملتا ہے؟ ان بے چاروں کو اندازہ تک نہ تھا کہ مجھے جیسے حقیقی حریت پسند کس حد تک زیر عتاب ہیں۔ لوگوں کو تعاویں سے روکنے کے لیے افواہیں پھیلائی گئیں کہ میں برطانیہ کی کشمیری کمیونٹی سے کروڑوں روپے لے کر آیا ہوں۔ کچھ تو ایسے ڈاکو نکل جنہوں نے مجھے لوٹنے کی کوشش کی۔ عارضہ قلب میں بتلا ہوا تو اے ایف آئی سی کے ڈاکٹر بمجر جزل ظفر اسلام صاحب نے بھی پوچھا کہ حکومت پاکستان یا کشمیر لبریشن سیل مجھے کچھ دیتا ہے؟ جزل ظفر اسلام بھی بڑی شفقت سے پیش آئے۔ چونکہ تحریکی مصروفیات کی وجہ سے میں خود کوئی کاروبار نہیں کر سکتا تھا، میں نے دو مرتبہ کسی کے ساتھ شیر زر کھے مگر

دونوں دفعہ وہ کاروباری کردار ڈاکو ثابت ہوئے۔ مجھے کسی نے بتایا کہ ہماری تحریک کے مخالفین نے میری رقم ہڑپ کرنے کے لیے میرے پارٹر سے سازش کے تحت بنک کر پسی کروائی۔ حقیقت جو بھی تھی اس واقعہ کے بعد اچانک خلیل، رفیق اور شفیق پیدا ہونے لگے۔ میں یکارہوا تو ڈاکٹر امجد انصاری صاحب نے میرا مفت علاج کیا جبکہ صدائے حق ڈیال کے خواجہ افتخار احمد صدیقی صاحب اور ڈاکٹر خواجہ حمید صاحب نے میرے باقی معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ یوں تو میں جیل کے دور سے عارضہ قلب میں بیٹلا ہوں لیکن گزشتہ سال نیرو پا تھی کے حملہ سے یوں لگا جیسے اب میں دوبارہ اپنے پاؤں پر چل نہیں سکوں گا۔ دوستوں اور رشتہ داروں کے تعاون، دعاوں اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میں ایک بار پھر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا جس کی وجہ سے حسب توفیق تحریک کی خدمت کر رہا ہوں اور جب تک دم میں دم ہے یہ خدمت جاری رہے گی۔ اس کام میں معاونین کی فہرست کسی اور موقع پر سامنے لائی جائے گی۔

۰۰۰

خاندانی اموات کا غم اور جہادی انکشافت

زندگی اور موت کا سلسلہ روز اول سے جاری ہے اور آخر تک جاری رہے گا۔ اپنوں کی موت ہر انسان کے دل دماغ پر اپنا اثر چھوڑتی ہے۔ مشترک خاندانی نظام میں انسان جذبائی طور پر ایک دوسرے کے زیادہ قریب ہوتے ہیں جبکہ طویل اسیری میں صرف روحانی رشتہ ہی باقی رہ جاتے ہیں اور روحانیت کے اثرات مختلف لوگوں پر مختلف ہوتے ہیں۔ جب انسان دیا غیر میں طویل عرصہ تک قید رہے تو اسے کبھی روحانیت کا سہارا لینا پڑتا ہے اور کبھی دل کو پتھر کرنا پڑتا ہے ورنہ وہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ جیل میں اسے کوئی سہارا دینے والا نہیں ہوتا خاص کر جب قیدی ہماری طرح ہائی رسک کمیگری میں ہو جہاں وہ مکمل تباہ ہوتا ہے تو خدا سے رشتہ یا تو بہت پختہ ہو جاتا ہے یا ٹوٹ جاتا ہے۔ دنیا کی ناقصانیاں انسان کو شاکی بنادیتی ہیں یا پھر اتنا مضبوط کہ دیکھنے والے سوچتے ہیں کہ شاید قیدی کو سکدل بنادیا ہے۔ میرے والد صاحب کی وفات کے وقت میری عمر صرف نوسال تھی۔ ہمارے وہ حقیقی پچھے بھی میری پیدائش سے پہلے فوت ہو گئے تھے۔ میرے دادا اور دادی اپنے جوان تین بیٹوں کی وفات کی وجہ سے بہت غم درہ رہتے تھے۔ اپنی اولاد کے ساتھ ان کے پیار کا حصہ بھی ہم پوتے اور پوتیوں کو ملا اور اپنی جائیداد کا بھی انہوں نے ہم کو برآ راست وارث بنادیا۔ دادا راجع طاعظ محمد صاحب نے اپنی زندگی میں ہی اپنی ساری جائیداد ہمارے نام کر دی تھی جس کی وجہ سے ان کی وفات کے بعد جائیداد کی منتقلی کا سوال کھڑا نہ ہوا۔ والد صاحب کی وفات کی وجہ سے ہم اپنے والد اور والدہ کے خاندانوں سے بہت قریب تھے۔ دونوں خاندانوں کے کچھ افراد نے ہمارے ساتھ انہی شفقت کا مظاہرہ کیا۔ علاقے میں میری والدہ اور والد کے خاندان کو بڑی عزت و احترام سے دیکھا جاتا تھا لیکن پاکستان کی سیاست کے اثرات بھی کسی حد تک پڑے جنکا اندازہ مجھے بڑی ہونے کے بعد ہوا۔

قید کے پہلے چند سال اللہ تعالیٰ کے فضل سے خاندان میں کسی موت کی خبر کا دکھنے سہنا پڑا۔ مگر پھر یکے بعد دیگرے تکلیف دہ خبریں ملنا شروع ہو گئیں۔ ان اموات میں میرے ماں مولانا راجہ کرمداد خان جو میری تعلیم کے دوران میری دیکھ بھال کیا کرتے تھے، ماں مولانا زاد پولیس اسپکٹر راجہ محمد

افسر خان عمر بیالیں سال اور حق پرست ماموں زاد بھائی راجہ محمد ایوب خان کے علاوہ میر اسب سے بڑا سہارا میرے بڑے بھائی نذیر راجہ چون سال کی عمر میں وفات پا گئے۔ نذیر راجہ 1973 سے ہالینڈ میں مقیم تھے۔ 1998 میں وہ برطانیہ قفل مکانی کر گئے۔ کہنے لگے ہالینڈ سے میرے ساتھ ملاقاتوں کے لیے آنے میں کافی دشواری ہوتی ہے مگر وہ انگلینڈ پہنچتے ہی بیمار ہو گے۔ لسٹر ہسپتال لندن داخل کیے گئے جہاں سے ایک دن میرے بھتیجے عارف نے مجھے فون کیا کہ ابو جی کو ڈاکٹر نے جواب دے دیا ہے۔ عارف نے مجھے حوصلہ دینے کی کوشش کی اور میں کچھ کہے بغیر اس کی باقی سننا رہا۔ اتنے میں جیل کی لیڈی ڈاکٹر ایکس بولڈنے مجھے بتایا کہ لسٹر ہسپتال کے ڈاکٹرنے اسے فون کیا ہے کہ میرے بھائی کی آخری خواہش ہے کہ میں ان سے ملوں۔ جیل کی لیڈی ڈاکٹر بھی دلکھی نظر آ رہی تھی۔ جیل انتظامیہ کا اجلاس ہوا۔ اسی ہفتہ شہزادی ڈیانا کا قتل ہوا تھا۔ پوری بڑش قوم ڈیانا کی موت کے سوگ میں تھی جس کے نتیجے میں جیل انتظامیہ نے وزیر داخلہ سے اس دنیا میں چند نوں کے مہماں بھائی کے ساتھ میری آخری ملاقات کی سفارش کی۔ وزیر داخلہ نے سفارش قبول کرتے ہوئے ملاقات کی اجازت دی مگر مجھے تعلم ہوا جب سیکورٹی اچانک میرے میں داخل ہوئی اور کہا کہ وہ مجھے بھائی کے ساتھ ملاقات کے لیے لے جا رہے ہیں۔ بھاری سیکورٹی کنوائے تین گھنٹوں کا طویل سفر کر کے جب لسٹر ہسپتال پہنچا تو وہاں بھی صدر دروازے پر مقامی پولیس کھڑی تھی۔ میرے ساتھ بھائی نذر صاحب کے ہاسپٹل روم میں داخل ہونے والے تین جیل افسران میں سے ایک خاتون تھی جو نفیسات میں ڈگری کر رہی تھی۔ چونکہ میں نے پہلے ہی نفیسات کی ڈگری کر کھٹی تھی تو وہ مجھے اپنے اسائمنٹ پر مجھ سے رائے لیا کرتی تھی۔ شاید اسی وجہ سے جیل انتظامیہ نے اسے میرے ساتھ جانے والی سیکورٹی ٹیم میں شامل کر دیا اور وہ کار کی عقبی نشست میں میرے ساتھ بیٹھ گئی مگر ہم دونوں کو ہتھکڑیاں پہنادی گئیں۔ راستے میں وہ میری حوصلہ افزائی کرتی رہی مگر جب بھائی نذر صاحب کے ساتھ میں نے گفتگو شروع کی تو وہ یہ سوچ کر آبدیدہ ہو گئی کہ یہ دونوں بھائیوں کی آخری ملاقات ہے۔ میری بھائی نے اس خاتون سیکورٹی افسر کو روتے ہوئے دیکھا تو اسے پانی کا گلاس دیا۔ میں جیل سے حدیث کی ایک کتاب لے گیا تھا جس میں سے بیماری کے حوالے سے میں نے بھائی صاحب کو وہ حدیث سنائی جس کے مطابق بیماری بخشش کا ذریعہ ہے۔ بھائی صاحب کو جب میں نے خدا حافظ کہا تو انہوں نے شہادت کی انگلی کھڑی کرتے ہوئے کشمیر زندہ باد کہا۔ یہ ان کے اخري الفاظ تھے۔ جیسا کہ ڈاکٹر کی روپورٹ میں لکھا گیا تھا، بھائی صاحب ایک ہفتہ بعد وفات پا گئے۔ جنازہ اٹون مسجد میں ہوا جو

میری لاگنگ لارٹن سے دو گھنٹوں کی مسافت پر تھا۔ جنازے میں میری شرکت کے انتظامات کیے گئے تھے۔ اس بار سیکورٹی زیادہ تھی کیونکہ لوٹن مسجد کے اندر ہونے والے جنازہ میں لوگوں کی بھاری تعداد تھی۔ جنازہ کے بعد موجود لوگ بڑے والہانہ انداز میں ملتے رہے۔ ذہنی طور پر میں اتنا تھک گیا تھا کہ واپس جیل پہنچتے ہی میں کھانا کھانے بننا سو گیا۔ دوسرا دن صبح بیدار ہوا تو میر اسیل خوبصورت مہک رہا تھا۔ اس خوبصورتی سمجھنیں آ رہی تھی۔ میں اسے بھی روحانیت کی کوئی شکل سمجھنے لگا کہ میں نے بستر سے اٹھ کر جنازے پر زیب تن کرنے والا لباس ایک کونے سے اٹھایا جو میں تھکا وٹ کی وجہ سے فوری اتار کر سو گیا تھا اس سے خوبصورتی۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ مسجد میں داخل ہوتے وقت کسی نے بہت ہی زیادہ پرفیوم میرے لباس پر لگا دی یا جومرد خواتین مجھے گلے لگاتے رہے ان کے کپڑوں سے خوبصورتی لباس پر منتقل ہو گئی۔ یہ بے شمار مثالوں میں سے ایک ہے جو ثابت کرتی ہے کہ ہمارے لوگ محب وطن ہیں۔ حقیقی حریت پسندوں کی ان کے دل میں بہت عزت ہے۔ بھائی صاحب کی موت نے میرے دل پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ والدہ صاحبہ بھی زیادہ پریشان رہنے لگیں۔ ان کی بیماری نے شدت اختیار کر لی۔ دو سال بعد وہ بھی دنیا سے چل بیسیں

فراقِ ہم نے ہماری رہائی کی مہم کو تیز کیا۔ بھاریٰ وزیر خارجہ کے دورہ برطانیہ کے دوران اس کے برطانوی ہم منصب نے بھارت کو خوش کرنے کے لیے پارلیمنٹ میں بیان داع غدیا کہ پہلک قیوم راجہ کی رہائی کے حق میں نہیں ہے۔ فراق نے میری مشاورت سے لوکل ایکشن میں یہ اعلان کر کے تین امیدوار چوہدری اللہ دوڑت، ناظم بھٹی اور ایک خاتون زائدہ بیگم کو کھڑا کیا کہ عوام نے اگر ہمارے امیدواروں کو ووٹ دیا تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ ہماری رہائی کے حق میں ہے۔ چوہدری اللہ دوڑت حکومتی پارٹی کے خلاف جیت گئے جبکہ دوسرے دو چند ووٹوں سے ہار گئے مگر اگلے ایکشن میں مزید چند لوگ جیت گے۔ جس دن ایکشن ہوئے اسی دن کھانا کھانے کے بعد مجھے قہ آئی۔ بے ہوشی کی حالت میں ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا جس نے کہا مجھے ہارٹ ایک ہوا ہے۔ ہسپتال لے جایا گیا تو ٹی وی پر پاکستان کے ایٹھی دھماکے کی خبر نشر ہوئی۔ میری نگرانی پر ماورے سیکورٹی افسران نے رد عمل میں میری چار پائی کو ٹھوکریں مارتے ہوئے کہا کہ کھانے کو روٹی نہیں اور نواز شریف ایٹھی دھماکے کے کر رہا ہے۔ دارو نے مجھے اتنے تنگ کرنے لگے کہ میں نے اپنے بستر کے ساتھ لگا آ لارم کا بٹن دبادیا۔ ہیڈ نرس بھاگتی ہوئی آئی۔ پہلے میں نے گھنٹی دبانے کی معذرت کی پھر پوچھا: کیا میں اس ہسپتال میں مریض ہوں یا قیدی؟ نرس نے کہا میں ڈاکٹر کو بلا قی ہوں۔ ڈاکٹر آیا اور اس نے کہا اس کے نزدیک

میں مریض ہوں۔ پھر میں نے اسے بتایا کہ یہ داروغے میری چار پائی کو لگاتار ٹھوکریں مارتے ہیں، شاید اس لیے کہ مجھے ایک اور ہارت اٹک ہوا اور ان کی جان چھوٹ جائے۔ ڈاکٹر نے جیل گورنر کو رپورٹ دی جس نے سیکورٹی تبدیل کی۔ نئی سیکورٹی میں ایک خاتون بھی تھی جو اتنی اچھی تھی کہ اس نے کہا وہ میری والدہ سے بات کرو سکتی ہے لیکن کسی کو بتانا نہیں۔ میں نے کہا یہ رسک ہے۔ تمہاری نوکری جاسکتی ہے۔ اس نے اپنے مرد ساتھی سے بات کر کے میرے لیے کسی ایشیائی ریسٹورنٹ سے روٹ لایا۔ میں نے تھوڑا سا کھا کر اسے کہا کہ مساںے بہت تیز ہیں۔ میں دل کا مریض ہوں۔ یہ تم کھالو۔ پھر بھی وہ کبھی بھی میرے لیے نرم غذا لے آتی اور دنیا جہاں کی باتیں کر کے میرا دل بہلانے رکھتی۔ اللہ سے خوش رکھے۔

مجاہدین کے بارے عورتوں کے مشورے:

جب میں بری ہو کر گھر پہنچا تو وہاں بھی جہاں لوگوں نے انتہائی دافٹگی کا مظاہر کیا وہاں گاؤں کی کچھ سادہ لوح خواتین سے میں یہ سن کر جیران ہوا کہ مجاہدین اچھے لوگ نہیں ہوتے۔ انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ مجھے مجاہدین سے دور رہنا ہو گا۔ پہلے تو مجھے ان خواتین کے موقف کی کوئی سمجھنے آئی۔ میں نے سوچا کہ یہ سادہ لوح خواتین ہیں جن کو جہاد کی اہمیت کا انداز نہیں لیکن ساتھ مجھے اپنایہ سوال بھی پریشان کر رہا تھا کہ اگر یہ خواتین ہیں جن کو جہاد کی اہمیت سے بے خبر ہیں تو میرے ساتھ اتنی ہمدردی کا اظہار کیوں؟ آہستہ آہستہ ان خواتین میں سے کچھ نے مجھے کہا کہ پاکستان سے جہاد کے نام پر جو لوگ آزاد کشمیر میں آتے تھے وہ لوگوں کے گھروں سے بکرے چوری کر کے کیمپوں میں لے جاتے تھے اور چشمموں سے پانی لانے والی خواتین کو تنگ کیا کرتے تھے۔ اس طرح کی بے شمار کہانیاں سن کر مجھے بہت افسوس ہونے لگا۔ مجاہدین کے کچھ گروہ بھی مجھے ملنے لگے اور ہر گروہ وہ سرے گروکی غیبت کرتا۔ جماعت اسلامی کے کچھ لوگ مجھے جیل میں ملا کرتے تھے جس کی وجہ سے بری ہونے کے بعد میں بھی جماعت اسلامی کے کارکنوں کے ساتھ میں جول رکھنے لگا تو دوسری جہادی تنظیمیں ناراض ہو گئیں۔ میری رہائی کے چند ماہ بعد ایکشن ہوئے اور یہ دیکھ کر بھی حیرت ہوئی کہ دینی جماعتوں نے سیکولر جماعتوں کو تو ووٹ دیے مگر جماعت اسلامی کی مخالفت کی۔ آج بھی دینی جماعتوں سیکولر جماعتوں کے ساتھ تو مفاہمت کر لیتی ہیں لیکن اپس میں اتحاد نہیں کرتیں۔ ایک دفعہ ایک جہادی تنظیم کے کمانڈر انچیف کو یورٹل تشریف لائے جہاں مجھے بھی دعوت دی گئی۔ مجھمل کر بڑے خوش ہوئے اور کہا کہ جس دن میں برطانیہ میں

گرفتار ہوا تھا اسی دن وہ تعلیمی ویزڈ پر برطانیہ پہنچ تھے۔ جب وہ جزل پرویز مشرف پر اپنا غصہ نکالنے کے بعد کشمیر میں جہاد بحال کرنے کی بات کرنے لگے تو میں نے کہا پشاور میں ہمارے کافی کشمیری ہیں۔ ہم طالبان کی مدد کے لیے ایک گروپ بنانا چاہتے ہیں۔ انہیں اندازہ نہ ہوا کہ میں ان کا ٹینسٹ لے رہا ہوں۔ وہ فوری بولے، نہیں نہیں وہاں پشاور میں ہم موجود ہیں۔ آپ کے ساتھی ہماری تنظیم میں شامل ہو سکتے ہیں۔ تب میں نے کہا۔ جناب مکانڈر صاحب۔۔۔ آپ پاکستان سے آ کر ہم کشمیریوں کی قیادت میں کام کرنا اگر تو کیمین سمجھتے ہیں تو ہم آپ کی قیادت میں کیوں جہاد کریں؟ تب وہ شرمندہ سے ہو گے۔ ہمارے نوجوانوں کو مشورہ ہے کہ جو کوئی جہاں سے آئے اگر وہ ہماری تحریک کا حصہ بننے کے بجائے اپنی الگ تنظیم قائم کرنا چاہتا ہے تو پھر اسکا اپنا ایجنسڈ ہے جس سے ہمیں خبردار ہنا چاہیے۔ ہم ساری زندگی نئے تجربوں کے محمل نہیں ہو سکتے۔

قوم پرست کیوں بدنام ہوئے؟

القوم پرستی کیا ہے؟ جب ہم نے جدو جہد کا آغاز کیا تو ہمارے نزدیک قوم پرستی نہیں قوم پروری تھی۔ قوم پروری سے مراقبیلہ پرستی اور برادری ازم کی مخالفت اور فرد کی صلاحیت کی حمایت تھی۔ ہم اپنی تربیتی تقریبات میں ساتھیوں کو کہا کرتے تھے کہ موروثیت کے بجائے میرٹ کو پروان چڑھانا ہے۔ اگر کسی بھی قبیلے کا فرد باصلاحیت ہے تو کسی بھی قسم کے ازم کے بجائے اس فرد کو تنظیم کے اندر پر موٹ کیا جائے اور اس کی صلاحیتوں اور خدمات کی بنیاد پر اسکو اپنالیڈر مانا جائے۔ جب میں بری ہو کر آیا تو کچھ لوگ مجھے قوم پرست رہنماء اور کچھ حریت کہر مخاطب کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ معلوم ہوا کہ قوم پرستی کے بارے بھی مختلف آراء پائی جاتی ہیں۔ کچھ لوگوں کے نزدیک قوم پرستی کا مطلب لا دینی سوچ تھی جو بالکل غلط ہے اور کچھ لوگوں کے نزدیک محب وطنی تھی۔ محب وطن تو ہرادی کو ہونا چاہیے ورنہ کسی سوسائٹی کا استحکام ممکن نہیں کیونکہ رنگ نسل مذہب اور قبیلوں میں تقسیم معاشرے پر بیرونی قوتیں آسانی سے قبضہ کر لیتی ہیں بلکہ ابن خلدون نے سات صدیاں پہلے کہا تھا کہ ریاست پر کسی ایک نسل یا گروکا زیادہ دیرتک حکومت کرنا بھی نقصان دہ ہے کیونکہ وہ قوم کے استحکام کی قیمت پر اپنا آپ مضبوط کرنا شروع کر دیتا ہے جس کے لیے اسے تابعدار اور نااہل لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے جس کے نتیجے میں موروثیت مضبوط اور ریاست کمزور ہوتی ہے۔ جدید ریاستی نظام میں ریاست کو بھی قوم کہا جاتا ہے لیکن ایسی قوم پرستی کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ حکومت کے غلط فیصلوں کی بھی حمایت کی

جائے۔ عراق اور فلسطین کے معاملے میں بے شمار یورپی عوام نے اپنی حکومتوں کی مخالفت کی جو کہا یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنی قوم کے خلاف ہیں۔ اس وقت ہر آزادی پسند کو مخالفین قوم پرست کہتے ہیں لیکن مجھے یہ اصطلاح پسند نہیں ہے کیونکہ ہم جس ریاست میں پیدا ہوئے ہیں اسکا صدیوں سے ایک جدا گانہ تشخّص کو ریاست کی خاطر زندہ رکھنے والوں پر قوم پرستی کا لیبل لگانا غلط ہے۔ لیبل تو ان پر لگنا چاہیے جو اپنی ریاست کی تشکیم کا موجب بن رہے ہیں۔

آزادی پسند کیوں بد نام ہوئے؟

آزادی کے سہانے خواب کی خاطر ہزاروں لوگ شہید اور لاکھوں بے گھر ہوئے۔ قربانی دینے والوں کو جہاں بے پناہ عزت ملی وہاں تحریک بدنام بھی ہوئی۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ آزادی پسند تنظیموں پر ایسے لوگ چھائے ہوئے ہیں جو ایک طرف شہیدوں کے نام پر خود سیاست کرتے ہیں لیکن غازیوں کو قبول نہیں کرتے۔ جو کبھی ادمی جیل سے واپس آتا ہے اسے تنظیم تحریک کے اندر اسکا مقام نہیں دیا جاتا۔ آزادی کا دشمن تحریک کو مزور کرنے کے لیے بھی چاہتا ہے لیکن آزادی پسند اپنے ساتھیوں کو کیوں سامنڈ لائے کرتے ہیں یہ عوام کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ ایسا کرنے والے یقیناً کچھ لوگ مخلص نہیں اور کچھ ہیں ہی پلامڈ۔ آزادی پسندوں کی بدنامی کی دوسرا وجہ دھڑے بندیاں ہیں جنہوں نے نوجوانوں کی تربیت کے بجائے انہیں ایک دوسرے کے خلاف کھڑا کر دیا۔ تیسرا وجہ تحریک کی کمرشلا نریشنا ہے۔ ایک طبقہ وہ ہے جس نے بھارتی مقبوضہ کشمیر سے پاکستان آ کر جاندار بنانے کے علاوہ کچھ نہیں کیا اور عملی عدو جہد کرنے والوں کو کیمپوں میں چھوڑ دیا۔ دوسری طبقہ الیسا ہے جسے پیسے کالا لچ دے کر جہاد میں شامل کیا گیا۔ میں جب بڑی ہو کر آیا تو بے شمار لوگوں نے مجھے مختلف تنظیموں کے کمانڈر کی حیثیت سے اپنا تعارف کروایا۔ جب میں نے پوچھا کہ وہ اب کیا کر رہے ہیں تو انہوں نے کہا جزوی مشرف کا بیٹا اغرق جس نے پیسے بند کر دیا۔ میں نے کہا ہم نے اپنی مدد آپ تحریک شروع کی تھی اور آج بھی جاری ہے جبکہ آپ پیسے کے لیے میدان میں آئے اور اب پیسے بند تو جہاد بھی بند۔ میں نے اپنا مکان بھی زمین بیچ کر بنایا۔ پھر بھی کچھ لوگ پوچھتے ہیں مجھے تنظیم کتنی تجوہ دیتی ہے؟ ہمیں اس تحریک کو منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے اسے گند سے پاک کرنا ہوگا۔

عورتیں کیسے مردوں کو پسند کرتی ہیں؟

یوں تو ہر کوئی اپنے بارے دوسروں کی رائے جانتا پسند کرتا ہے۔ رائے اچھی ہو تو لوگ خوش بھی ہوتے ہیں۔ بری ہو تو برا بھی مانتے ہیں بے شک حق کیوں نہ ہو لیکن عورتوں کی زبانی مردوں کی تعریف پر میں نے کئی مردوں کو بے ہوش ہوتے بھی دیکھا ہے جبکہ بعض نا تجربہ کا مرد حضرات عورت کو صرف جنس مخالف کے طور پر دیکھتے ہیں۔ وہ عورت کی عظمت، عفت اور صلاحیت پر کم ہی توجہ دیتے ہیں۔ اس کے برعکس عورت مرد کی کامیاب زندگی کو زیادہ اہمیت دیتی ہے اور مرد بحران پر تو وہ بہت ہی اعتماد کرتی ہے۔

جیل ایک الیک جگہ ہے جہاں اپنے سامانے پر بھی اعتبار و اعتماد کرنا مشکل ہوتا ہے۔ میں نے ہمیشہ خود کو شک کا شکار ہونے سے بچانے کی کوشش کی۔ احتیاط اور شک کے درمیان فرق رکھنے کی بھروسہ پوکو شک کی۔ کسی بھی تجربے کے لیے ماڑیں پہلے ماحول کو کثروں کرتے ہیں جس کے اندر وہ جس گروپ پر ریسچ کرتے ہیں اس کا عمل دیکھنے کے لیے اسے مخصوص ماحول میں ڈال کر آزاد گروپ یا عام ماحول میں رہنے والے گروپ کے رد عمل سے موازنہ کرتے ہیں۔ چونکہ جیل قدرتی طور پر ایک کثروں والہ ماحول ہوتا ہے جہاں ماڑیں غیر محسوس طور پر قیدیوں پر ریسچ کرتے رہتے ہیں۔ بعض اوقات وہ قیدی کا رد عمل دیکھنے کے لیے اسے دانستہ شک کرتے ہیں اور قیدی سوچتا ہے کہ اسکا یوں ہی کسی برے افسر سے واسطہ پڑ گیا۔ نفیسیات کی ڈگری کے لیے بہت زیادہ ریسچ کرنی پڑتی ہے۔ مقالہ جات لکھنے پڑتے ہیں۔ اسی وجہ سے مجھے نفیسیات، قانون اور صحافت میں ڈگری کی اجازت نہیں مل رہی تھی جو میں نے بالآخر ہائی کورٹ میں رٹ کر کے حاصل کر لی۔ مجھے بھی جب کئی بار بلا وجہ

اشتعال دینے کی کوشش کی گئی تو میں نے جیل کے سٹاف پر ڈائری لکھنا شروع کر دی اور جان بوجہ کر کچھ نوٹس گورنر کے دفتر کے سامنے گرا دیے۔ مجھے معلوم تھا کہ انہیں پڑھ کر میرے ساتھ کھیل کھیلنے والے مجھ سے دور رہنے کی کوشش کریں گے۔ یہی ہوا۔ میں جب بھی کسی افسر سے ملتا تو وہ میرے سامنے بہت ہی مختصر گفتگو کرتا تاکہ میں اس کے منہ سے کچھ الگوانہ لوں۔ اس پر مجھے بہت مزہ آتا لیکن اس وقت میرے لیے بھی کافی مشکل پیدا ہو گئی جب جیل کی خواتین میرے نزدیک ہونا شروع ہو گئیں۔ ہپتال، امبوکیشن، سائیکالوچی، پروبیشن ڈیپرٹمنٹ اور اکاؤنٹ افس میں تو پہلے ہی خواتین کی تعداد زیاد ہو اکرنی تھی لیکن 1987 میں اس وقت کی خاتون وزیر اعظم مارکریٹ تھپر نے مساوی موقع کابل پاس کرو کر جیل سیکورٹی میں بھی خواتین کو بھرتی ہونے کی اجازت دی۔ اس وجہ سے اب مجھے خواتین سے براہ راست واسطہ پڑتا تھا۔ ان کا روایہ میرے ساتھ بہت نرم تھا۔ کچھ قیدی کہتے کہ میں چہرے سے معصوم لگتا ہوں اس لیے عورتیں مجھے خطرہ محسوس نہیں کرتیں جبکہ پنجابی سکھ کہتے کہ راجہ صاحب دیاں اتنی تھے وہ موچاں نے اور میں سوچتا کہ میرا بیکار خراب کرنے کے لیے مجھے بدنام ہی نہ کر دیا جائے۔ مجھے ہر سالانہ رپورٹ میں ماڈل قیدی قرار دیا جاتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ جیل کے اندر کچھ ایسے سٹاف ممبراں بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ میں دہشت گرد ہو کر ماڈل کیسے ہو گیا۔ یورپ میں معمولی سی غلطی یا غلط فہمی پر بھی مرد پر جنسی ہراسمنٹ کا الزام لگ جاتا ہے جس کی وجہ سے میں بہت ہی احتیاط سے خواتین کے ساتھ اختریکشن کرتا۔ یہ خواتین پہلے تو اپنی میں چہ میکوئیاں کرتیں کہ راج (Quayyum Raja) افسران جب اچھے موڑ میں ہوتے تو مجھے راج کے بجائے راج کہتے ہیں۔ اتنا کم گواہ محتاط کیوں ہیں لیکن انہوں نے اپنا کنفیوژن دور کرنے کے لیے مجھے وجہ پوچھنی شروع کر دی۔ سائیکالوچی ڈیپرٹمنٹ کی سربراہ موئیکا نے ایک رپورٹ میں لکھا کہ:

"Quayyum Raja is reticent and polite, but can be

bluent if pushed around." یعنی قیوم راجہ کم گواہ شاستہ ہے مگر تنگ کیا جائے تو سخت بھی ہو سکتا ہے۔ موئیکا کے ساتھ ایک نوجوان جو نیبر مائز نسیمات سو نیا تھی۔ ان دونوں نے مجھے اپنے شعبہ سے کسی بھی موجود کتاب کا مطالعہ کرنے کی اجازت دے رکھتی ہے۔ بعض اوقات تباadelہ خیالات کے لیے مجھے بیٹھنے کی دعوت بھی دیتیں مختلف نسلوں کی اقدار پر گفتگو کرتیں۔ مائز نسیمات اور پروبیشن افسران کو رپورٹ کے لیے قیدیوں کے ساتھ ملاقاتوں کا وقت طے کرنا پڑتا تھا لیکن مجھے ملنے کے لیے وہ پر آ جاتیں یا اپنے دفتر بلایتیں۔ ایک دفعہ ایک پروبیشن افسر کا تباadelہ ہوا تو وہ روپڑی کیوں کہ

اس نے میری فائل پڑھ کر کی تھی جس بتاتی تھی کہ شاید میں کبھی زندہ باز نہیں جا سکوں گا۔ لینڈنگ سیکورٹی افسران کا قیدیوں کے ساتھ ہر وقت براہ راست رابطہ رہتا تھا۔ قیدی کے سیز کھولنے بند کرنے، کھانا دینے اور دیگر روٹین کی سرگرمیوں کے دوران قیدیوں پر براہ راست نظر ہوتی ہے۔ اس طرح قیدیوں کے ساتھ ملنے والے کا انہیں زیادہ موقع ملتا ہے۔ ان خواتین نے جب مجھے ٹوٹنے کی کوشش کی تو میں نے بھی غیر محسوس انداز میں ان سے مختلف نوعیت کے سوالات پوچھنے شروع کر دیے۔ میں اس طے میں جانا چاہتا تھا کہ وہ میرے ساتھ اتنا زم کیوں ہیں؟ کیا وہ کوئی راز لینا چاہتی ہیں یا کوئی اور وجہ ہے؟ جس کسی کو میں نے ٹوٹا اس نے کہا آپ مرد بھر ان ہیں۔ آپ دیا غیر میں قید ہیں۔ آپ کی فیلی بھی بیہاں نہیں ہے۔ آپ پر سخت پابندیاں ہیں جنکا ہمیں افسوس ہے مگر آپ کا ہر رد عمل قانونی ہوتا ہے۔ ایک کا نام شیرل تھا۔ وہ بڑی اچھی حس مزاج کی مالک تھی۔ اس نے شرارت کرتے ہوئے کہا:

"I like the way you fight back. Don't let them win. If you stay cool, you will never lose."

ہسپتال میں مرد ڈاکٹر ہے تھے اور لیڈی ڈاکٹر بھی۔ ان کی ڈبوٹی بدلتی رہتی۔ لیڈی ڈاکٹر جب ڈبوٹی پر ہوتی تو قیدیوں کا معائنہ کرتے وقت سیکورٹی افسر قیدی کے پیچھے ہٹا رہتا تھا لیکن جب میں لیڈی ڈاکٹر کے پاس جاتا تو سیکورٹی افسر کثیر کمرے سے باڑنکل جاتا اور ڈاکٹر اگر زیادہ مصروف نہ ہوتی تو زاتی گپ شپ شروع کر دیتی۔ ایک دفعہ میں نے صنف نازک کے عنوان سے انگریزی میں ایک ارٹیکل علامہ اقبال کے شعر جودوزن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ کے ریفرنس سے لکھ کر لیڈی ڈاکٹر کو دیا۔ اس شیرکی بچی نے میرادہ ارٹیکل میری میڈیا یکل فائل میں لگا دیا۔ ۲۲ سال کے عرصہ میں کئی بار میں یہاں رہا۔ جب بھی میری فائل کوئی ڈاکٹر ایز کھلوٹی تو اس کی نظر پہلے میرے اس ارٹیکل پر پڑتی۔ جب وہ مجھے ملتے ہی مسکرا دیتے تو مجھے اندازہ ہو جاتا کہ انہوں نے مجھ سے ملنے سے پہلے میرا ارٹیکل پڑھ لیا ہے۔ مجھے ہارٹ اٹیک ہوا تو ریڈ ہسپتال لے جایا گیا۔ راستہ میں مجھے ٹیکہ لگا دیا گیا تو میں سو گیا۔ ہیدار ہونے پر مجھے پتہ چلا کہ میں تو کسی ہسپتال میں ہوں۔ نرسوں نے ڈاکٹر کو بتایا کہ میریں جاگ گیا ہے۔ ایک لیڈی ڈاکٹر مجھے ملنے آئی جس کی والدہ انگریز اور والد افریقی تھا۔ وہ ملتے وقت نہ پڑی اور میں سوچنے لگا کہ مجھے ہارٹ اٹیک ہوا ہے اور یہ پاگل نہس رہی ہے۔ بعد میں پتہ چلا یہ صنف نازک پر میرے ارٹیکل کا مکمال تھا۔ باز ریڈ ہسپتال سے جب مجھے واپس لانگ لارڈن جیل

کے ہسپتال میں لے جایا گیا تو کلینیر ڈیوٹی نہ رہی۔ جیل ہسپتال میں صرف ہسپتال کے کھانے کی اجازت ہوتی ہے لیکن میرے لیے چوہاں نامی ایک سکھ نوجوان کھانا پا کر لے آتا اور کلینیر چپکے سے مجھے دے دیتی۔ ان حالات میں وہ مجھے فرشتہ لگاتی تھی۔ کبھی کبھار میرے پاس بیٹھ جاتی اور خاموشی سے کچھ سوچتی رہتی۔ جیل میں ہندو قیدی بھی تھے۔ وہ مجھ سے دور رہتے اور سکھ میری دیکھ بھال کیا کرتے تھے جبکہ عرب قیدی تو بہت ہی رحم دل اور ہمدرد تھے۔ کرئیل قذافی کے کچھ نوجوان سیاسی قیدی تھے۔ وہ جب بھی کٹشین سے اپنے لیے سودا لیتے تو میرے لیے بھی لے لیتے۔ بری ہونے کے بعد میں لیبیائی سفیر متعین اسلام آباد سے ملنے لگا تو نجیب، حسن اور حسین نامی سابق قیدیوں کے پتے میں نے حاصل کرنے کی کوشش کی مگر سفیر نے کہا جب آپ لیبیا کرئیل قذافی سے ملنے جائیں گے تب اپنے سابق قیدی دوستوں سے بھی مل لینا مگر جیسا کہ پچھلے صفات میں ذکر کیا، ہمارے وفد کو لیبیا بھیجنے کے انتظامات کیے جا رہے تھے کہ کرئیل قذافی کے خلاف بغاوت ہو گئی۔

میں نے پیشناہ سایکا لو جیا یونیورسٹی کے ایک میکریں دینی سائنس کا وجہت میں ایک مضمون لکھا جسے پڑھا کر ایک ماہر نفسیات ڈبی کولن نے مجھے لانگ لارٹن جیل میں خط لکھا۔ چند خطوط کے تبادلہ کے بعد اس نے مجھ سے ملاقات کی خواش کا اظہار کیا۔ جس دن وہ مجھے ملنے کے لیے جیل کے گیٹ پر پہنچی اس دن مجھے بھائی نزیر صاحب کے جنازے پر لے جانے کے لیے گیٹ سے باہر نکلا جا رہا تھا۔ ہم نے ہاتھ ہلا کر ایک دوسرے کو سلام کیا۔ سیکورٹی نے اسے بتایا کہ میرے بھائی فوت ہو گئے ہیں۔ مجھے جنازے پر لے جایا جا رہا ہے اور اگلے دن کے لیے اس کی ملاقات بک کر دی گئی۔ ڈبی جب آئی تو اس نے کہا میں جانتی ہوں آپ پر کیا گزر رہی ہو گئی کیونکہ میرا بھی ایک اکیس سالہ بھائی کا رحادث میں فوت ہو گیا تھا۔ اس کے بعد میں سات سال مزید جیل میں رہا اور یہ سارا عرصہ ڈبی مجھے ہر ماہ ملتی رہی۔ جیل کی اکثر معلمات دو سال کے معابدے پر جیل میں قیدیوں کو پڑھانے آیا کرتی تھیں۔ لانگ لارٹن جیل میں مجھے بھی معدود رہوں کی تدریس پر لگا دیا گیا۔ معدود رہوں کا ایک گروپ ہفتے میں تین دفعہ جیل آیا کرتا تھا جن کے ساتھ ایک نگران ہوتا اور پڑھانے والے زیادہ تر تعلیم یافتہ قیدی ہوتے۔ اس طرح انتظامیہ تعلیم یافتہ قیدیوں سے استفادہ کرتی۔ جو بھی معلمہ اپنا کھٹک کھٹک کر کے جاتی وہ مجھے جیل میں ملنے آیا کرتی تھی۔ میں نے درجنوں خواتین سے یہ سوال کیا کہ عورتیں کیسے مردوں کو پسند کرتی ہیں۔ میں نے کہا میں اب ایک مصنوعی دنیا میں ہوں۔ آپ مجھے صنف نازک بارے ایجاد کیتے کریں تاکہ میں بری ہو کر کامیاب ازدواجی زندگی گزار سکوں۔ ان

خواتین نے کہا مرد عورتوں کو اچھی طرح سنتے نہیں۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ عورت ان کی بات غور سے سنبھالی اور عمل بھی کرے لیکن وہ خود عورت کو وجہ سے نہیں سنتے۔

"The men are bad listeners."

پھولوں کی سچ نہیں۔ ازدواجی زندگی میں نشیب و فراز آتے رہتے ہیں لیکن جو مرد دور ان بھر ان تھیار ڈال دے اسے عورت پسند نہیں کرتی اور برطانیہ میں طلاقوں میں اضافے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے جس کی وجہ سے کئی عورتیں سوچتی ہیں کہ شادی کا فائدہ ہی کیا ہے؟ مجھے کہنے لگیں کہ ہم دیکھ رہی ہیں کہ تم حق بات پر ڈٹ جاتے ہو لیکن کئی دوسرا قیدیوں کی طرح دشام طرازی نہیں کرتے۔ اس لیے ہمیں تم سے ہمدردی ہے۔ جیل کی خواتین افسران کے یہ دلچسپ قصے کہاںیاں سن کر میں اپنی ماڑ نفیسات ملقاتی ڈبی کی رائے لیتا کہ آیا واقعی انگریز خواتین ایسا سوچتی ہیں تو اس نے کہا صرف انگریز نہیں ہر معاشرے کی ہر خاتون یہی سوچتی ہے۔ وہ چاہتی ہے اس کا جیون سا تھی اسے دل سے چاہے، سنبھالنے اور توجہ دے۔ خواتین جب کہتی ہیں کہ ان کو سنا جائے تو ان کا صرف یہ مطلب نہیں کہ انہیں اظہار خیال کا موقع ملے بلکہ ان کے جذبات اور خیالات کی قدر بھی کی جائے۔ ڈبی کے مطابق عورت کو اپنے گھر میں صرف سکون اور تختہ چاہیے۔ مجھے گھر آئے ہوئے 18 سال ہو گئے ہیں۔ ڈبی کا آج بھی میرے ساتھ رابطہ ہے جس کا میری الہمہ کو علم ہے مگر اسے معلوم ہے کہ یہ پاکیزہ تعلق ہے۔ پانچ اکتوبر 2006 کو جب میری پہلی یعنی مومنہ نے جنم لیا تو سب سے پہلے مجھے بیرون ملک سے ڈبی کا بھی کے لیے تھنوں کا پارسل ملا جس میں کپڑوں کے دو جوڑے، بلوں کے دو جوڑے اور بیپروں کا ایک بیگ تھا۔

وطن واپس آ کر شادی سے پہلے میں نے متعدد خواتین کے انٹرویو یوں کیے۔ تحقیق کا ایک طریقہ ہے سروے ہے جس میں لوگوں کو سوالنامہ پیچ کر ان کی رائے لی جاتی ہے۔ تحقیقی زبان میں اسے مقداری تحقیق کہا جاتا ہے اور براہ راست بات چیت کو معیاری تحقیق کہا جاتا ہے۔ سوالنامہ میں یقین نہیں کیا جاسکتا ہے کہ پوچھنے کے سارے سوالوں کے جوابات درست اور غیر جانبدارانہ ہیں لیکن براہ راست نفتگلوں میں جواب دینے والے کی حرکات و سکنات کے علاوہ محقق گہرائی میں جا کر اصل موقف حاصل کر سکتا ہے۔ ہمارے ہاں تحقیق تو ہوتی ہی بہت کم ہے جس کی وجہ سے سوالنامہ کے جواب پر انحصار کرنا مشکل ہے۔ اس لیے موقف جانے کے لیے براہ راست نفتگلوں بہتر ہے۔ ہمارے معاشرے میں تعلیم یا فتنہ خواتین ارتقائی عمل سے گزر رہی ہیں۔ جو مرد انکو آگے بڑھنے کا موقع دیتے

ہیں خواتین ان کی عزت تو کرتی ہیں لیکن مرد مجموعی طور یہ سمجھتے سے قاصر ہیں کہ اگر وہ چاہتے ہیں کہ ان کی بیٹیاں، بہنیں اور بیگمات کو پیشہ وار ادا نہیں کریں تو انہیں اداروں کے اندر مردوں کے ساتھ مسابقت کے لیے گھر پر مردوں کو گھر کے کام کا ج میں ہاتھ بٹانے کی ضرورت ہے۔ ہمارے معاشرے میں مردوں کو عورتوں کے بارے سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ وہ بہت زیادہ مادہ پرست ہیں۔ ان کے پاس جتنے زیادہ پیسے ہونے اتنے زیادہ ان کے پاس جوتے، کپڑے اور زیورات ہوں گے۔ فونگلی پر بھی ان کو اپنے کپڑوں کی فکر ہوگی اور ایک دوسرا کے مقابلے میں لباس بدلتی رہتی ہیں اور سوگ منانے والی عورتوں پر طرح طرح کی تنقید کرتی رہتی ہیں۔ ہماری کچھ خواتین کی یہ بھی کوشش ہوتی ہے کہ مرد دن بھر کے تجربات و مشاہدات شام کو ان کے ساتھ شیر کریں۔ میرے جانے والے ایک ڈاکٹر کی اہمیت میں شکایت کرتی ہے کہ اسکا خاوند اسے دن میں ملنے والے مریضوں کے بارے کوئی بات پوچھنے پر ناول دیتا ہے جبکہ ڈاکٹر کا موقف ہے کہ مریضوں کی بیماری کی تشویش مناسب نہیں جو درست موقف ہے۔

ترک خواتین بہت بہادر اور متحرك ہیں۔ وہ باہمی احترام پر یقین رکھتی ہیں لیکن وہ کچھ شعبہ جات کو مسلال فوج میں نوکری کو اپنے لیے موزں تصویب نہیں کرتیں۔ وہ اس مرد کو زیادہ پسند کرتی ہیں جو عورت کی خوبصورتی کے بجائے اس کی سیرت و صلاحیت کی بنابر اس کو اہمیت دے۔ چند سال قبل میں ایران گیا جہاں مغرب عورتوں پر پابندی کا بہت واویلا کرتا ہے۔ جیسا کہ اوپر زکر کیا، انگریز خواتین نے مجھے کہا تھا کہ دنیا کی ہر عورت مرد سے تحفظ توجہ اور فواداری کی طلبگار ہے۔ ایران کی فروعی یونیورسٹی کی چند یونیورسٹیز اور پی ایچ ڈی سکالر زکی رائے بھی میں نے لی تاکہ دیکھوں کہ انگریز خواتین کا یہ دعویٰ کہاں تک درست ہے کہ دنیا کے ساری عورتوں کے مسائل ملے جلتے ہیں۔ ایرانی خواتین کو بہت اچھا لگا کہ میں ان کے موقف کی جائزگاری کو اہمیت دے رہا ہوں۔ وہ اتنی خوش ہوئیں کہ مجھے ایران کے قومی شاعر ابو القاسم فردوسی، امام غزالی اور کئی دوسری یادگاروں پر لے گئیں۔ ان کے ساتھ ہنڑہ کی ایک سکالر معصومہ بھی تھی جو ادب میں پی ایچ ڈی کر رہی تھیں۔ بایران کے ایک بڑے اخبار خراسان نے جب میر انضرو یوکیا تو محترمہ معصومہ نے مترجم کے فرائض سرانجام دیے۔ سنی مسلم ڈاکٹر زینب کے علاوہ باقی ساری خواتین شیعیہ مسلم تھیں۔ انہی دنوں ڈاکٹر زینب کے بھائی کی شادی تھی تو مجھے مشہد سے تین سو کلومیٹر دور اپنے گھر لے گئیں جہاں ایرانیوں نے کشمیر کا نام سن کر مجھے کسی شہزادے جیسا پروٹوکول دیا۔ یونیورسٹری مارشا آزمودے، ڈاکٹر زینب اور شاعر تجمیعہ مظفری مجھے

مسلسل ایران سے اچھی برقی خبریں شیئر کرتی رہتی ہیں اور کہتی ہیں کہ میں ایک بارا پنی اہلیہ اور نبیوں کے ساتھ ایران کا دورہ کروں لیکن ہزاروں خواتین ایسی کہ ہر خواتین پر دم نکلے۔

آزاد کشمیر میں مجھے یونیورسٹیوں اور کالجوں کے دوروں کے دوران متعدد خواتین سے ملاقاتوں کا موقع ملا۔ کھوئی رہ میں تربیت کرنے والی ایم اے اور بی اے کی کچھ ایسی خواتین سے بحثیت لیکچر گنٹلمنوں کو موقع ملا جن کی اکثریت تعلیمی اداروں میں درس و تدریس کے فرائض سرانجام دے رہی تھیں۔ میں نے ان خواتین کو بہت ہی مجبور و کنفیز پایا کیونکہ زیادہ تر نصاب مغرب سے امپورٹ کیا گیا ہے جسے یہاں رہ کر سمجھنا بہت مشکل ہے۔ ایسا نصاب جو طباء و طالبات کی سمجھ میں نہ آئے اور وہ صرف امتحان پاس کرنے کی نیت سے رٹالگاں نہیں وہ کسی کے اندر تحقیقی صلاحیتیں پیدا نہیں کر سکتا۔ ہمارے معاشرے میں کچھ ایسی خواتین بھی ہیں جن کی اپنی انفرادیت ہے لیکن مجموعی طور ہماری خواتین تین تین قسم کی کینیگری میں تقسیم ہیں۔ ایک کینیگری وہ جو معاشری طور پر مضبوط گھرانے کے مرد کی تلاش میں ہوتی ہیں جس کی وجہ ہماری معاشری ابتوی جس کے باعث خواتین اپنی مرضی و معیار کے جیون ساتھی کا انتخاب نہیں کر پاتیں۔ انہیں جو ان ساتھی کی اہلیت، صلاحیت اور نظریہ کو نظر انداز کرنا پڑتا ہے۔ اجتماعی خاندانی نظام میں عورت کی زندگی کا فصلہ بھی اجتماعی طور پر کیا جاتا ہے جس میں اس کی اپنی رائے کا عمل دخل کم ہوتا ہے بے شک آدھے سفر میں ازوای جی ازدواجی زندگی کی شام ہو جائے۔ دوسرا کینیگری اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین کی ہے جو خود اپنی ایڈ جسٹمنٹ کی متاثری ہیں اور وہ سیاسی نظام کے ساتھ سمجھوتے کر لیتی ہیں۔ تیسرا کینیگری ان نظریاتی اور ویژہ خواتین کی ہے جو مرد کی سوچ فکر نظریہ اور شخصیت کی بنابر ان کا انتخاب کرتی ہیں لیکن ہر ایک کی قسمت اس کا ساتھ نہیں دیتی۔ اس سوچ کی مالک کچھ ایسی خواتین بھی ہیں جن کی آئڑیں کے انتظار میں زندگی گزر جاتی ہے اور معاشرہ انہیں ناکام عورت کے طعنے دے ازیت دینے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ ہر معاشرے کا اپنا معیار ہوتا ہے اور لوگ اسی معیار کے مطابق انسان کی کامیابی اور ناکامی کا امتحان لیتے ہیں۔ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ عورت کی سب سے زیادہ مخالفت عورت ہی کرتی ہے۔ کچھ خواتین ایک دوسرے کا سہارا بنتی ہیں اور کچھ حسد کرتی ہیں۔ حسد تو مرد بھی کرتے ہیں لیکن وہ عورتوں کی نسبت کم باتوںی ہیں۔

پروفیشنل لائف میں ایک خاتون کو مرد کی نسبت زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے کیونکہ ایک تو اس پر گھر کا بوجھ بھی ہوتا ہے اور پھر مردوں کے بنائے گئے اداروں میں دوں کی اکثریت کے ساتھ خواتین کی مسابقت ایک مشکل کام ہے۔ آزاد کشمیر کی جس ریسروچ سکالر سے میں بہت متاثر ہوا وہ

مولانا مسعودی کی نوای حفصہ مسعودی ہیں۔ ان کا تعلق نیلم سے ہے لیکن مظفر آباد میں رہائش پزیر ہیں۔ وہ ایک تحقیقی اور نظریاتی سوچ رکھنے والی مضبوط اعصاب و ارادوں کی مالک چٹان نما دلیر خاتون ہیں لیکن ایسی صلاحیتوں کا امالک انسان اس معاشرے میں صفت ہے۔ حفصہ مسعودی کے کچھ قدر میں رشته دار زندگی میں شہید ہو گئے تھے۔ ان کے جوان بھائی کسی بیماری کا شکار ہو گے۔ والد صاحب بھی چل بے لیکن ان کا تحقیق و تغذیق کا کام متاثر نہیں ہوا۔ وہ علم کا سمندر اور قلم کی ملکہ ہیں۔ ایک نظریاتی خاتون کی حیثیت سے وہ نظریاتی کشمیری نوجوانوں کی بہت قدر کرتی ہیں۔ ہمارے معاشرے کو ایسی خواتین کی بہت ضرورت ہے لیکن اہل سیاست کو صرف گوگل اور بہرے پیروکاروں کی ضرورت ہے جو صرف اشاروں پر چل سکیں۔ لگتا ہے کہ وہ اپنے نظریات کی وجہ سے ہی ابھی تک کسی سرکاری ادارے میں ایڈ جسٹ نہیں ہو سکیں ورنہ آزادے معاشرے حفصہ جیسے باصلاحیت انسانوں کے محتاج ہوتے ہیں۔ ہمیں کیا خبر کہ یہاں کتنی حصیں اس ظالم، جابر اور استھانی معاشرے میں خاموشی سے ظلم و تم برداشت کر رہی ہیں لیکن:

رہے گا کوئی تو تنغ ستم کی یادگاروں میں
میرے لاشے کے ٹکڑے دفن کرنا سو مزاروں میں
کسی کی نگسخ مخمور کچھ کہہ دے اشاروں میں
مرا ہے رات دن چلتے رہے پرہیزگاروں میں۔

کشمیری خواتین کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ اے سی اے کے علمی مقابلوں میں گڑھی دوپٹہ مظفر آباد سے تعلق رکھنے والی زار انعام ڈارنے ٹاپ کیا ہے۔ اس امتحان میں 179 ممالک کے 527000 طلباء و طالبات نے حصہ لیا تھا۔ یہ رپورٹ دنیا بھر کے میڈیا نے شائع کی جو گول پر بھی دیکھی اور سنی جاسکتی ہے۔

چودہوال باب

برطانوی حکام اور عوام کیسے لوگوں کو پسند کرتے ہیں؟

برطانوی حکام:

سرکاری حکام اور عوام میں ہمیشہ فرق ہوتا ہے۔ محقق اور تجزیہ نگار کو یہ فرق قائم رکھنا چاہیے۔ برطانیہ نے دنیا پر حکومت کے لیے جن صلاحیتوں سے استفادہ کیا ان میں سب سے پہلے ان کا انسانوں سے کام لینے کا فن ہے اور منصوبہ بندی کی صلاحیت ہے۔ یعنی ہی تو تھا کہ چالیس ہزار انگریزوں نے ایک بلین کے قریب ہندوستانیوں میں سے ہی کچھ لوگوں کی فوج بنانا کرانجی کے ملک کو غلام بنا لیا اور عرب قبائل کو عثمانیوں کے خلاف استعمال کر کے سلطنت عثمانیہ کو نست و نابود کر کے پورے عرب پر پقصہ کر کے برطانیہ اور فرانس نے اسے اپس میں بانٹ لیا۔ بے شک کوئی کہے کہ انگریز چالاک، ہوشیار اور مکارتھی لیکن ہندوستانی اور عرب بھی تو نالائق اور حمق تھے ورنہ انگریز کا میا بند ہوتے اور نہ ہی فلسطین اور جموں کشمیر تقسیم ہوتے۔ انگریز ایسے بے صلاحیت، خود غرض اور موقع پرست لوگوں کو زیادہ پسند کرتے ہیں جن کو وہ با آسانی استعمال اور کثیر و کمکیں۔ یہ میری جیل کی تحقیق تھی لیکن جب وطن واپس آیا تو دیکھا کہ ہندوستان اور پاکستان بھی ایسے ہی لوگوں کو پسند کرتے ہیں جس کی وجہ سے دونوں نے کشمیر پوں پر خود غرض سیاسی خواری مسلط کر رکھے ہیں۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ دنیا کے سارے اسخالی طبقوں کی سوچ ایک جیسی ہے البتہ بریت میں تھوڑا بہت فرق ہو سکتا ہے۔ انگریز کی قائل کرنے کی پالیسی جب ناکام ہو جاتی ہے تو وہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے انتہائی سُندلانہ اور ظالمانہ انداز سے بھی گریز نہیں کرتا جس کی دنیا میں ہزاروں مثالیں موجود ہیں۔ انگریز کوئی کام اندھا دھنڈتیاری کے بغیر نہیں کرتے۔ تیاری کا مطلب یہ ہے کہ وہ جس پر حملہ کرنے کا منصوبہ بناتے ہیں پہلے اس کی طاقت کا جائزہ لیتے ہیں۔ اگر وہ زیادہ طاقتور ہے تو اس پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے خود کو اس جیسا یا اس سے بھی زیادہ طاقتور بنا کر حملہ آور ہوتے ہیں یا سازش کے ذریعے دشمن

کومات دیتے ہیں جس طرح انہوں نے امریکہ کے ساتھ مل کر جرمی، سلطنت عنانیا اور سوویت یونین کو دی اور اب امریکہ اور برطانیہ اپنی اجارہ داری قائم رکھنے کے لیے مسلمانوں کو تقسیم رکھنے کی پالیسی پر گامز ہیں جبکہ ہم دوسرے زیادہ دعا پر یقین رکھتے ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ نے جب عراق پر حملہ کیا تو بی بی نیوز ناٹس کے پروگرام میں خاتون صحافی نے بڑش وزیر خارجہ ابن گک سے پوچھا کہ اگر صدام پر ڈکٹیٹر شپ کا انعام لگا کر عراق پر حملہ کرنا درست ہے تو چین میں روس کی بربیت روکنے کے لیے روسی ڈکٹیٹر پر کیوں نہیں حملہ کیا جاتا؟ برطانوی وزیر خارجہ نے کھل کھلتے ہوئے صحافی کو کہا تمہیں معلوم نہیں کہ روس ایک نیو گلوبنر پاور ہے؟

برطانوی عوام کیسے انسانوں کو پسند کرتے ہیں؟

برطانوی لوگ دوسرے یورپی لوگوں کی نسبت بظاہر کم گواور سخیدہ نظر آتے ہیں لیکن قریب جا کر پتہ چلتا ہے کہ ان میں بھی جس مزاح کافی پائی جاتی ہے۔ وہ خاموشی سے انسان کی صلاحیت و شخصیت کا جائزہ لیتے رہتے ہیں۔ کسی انسان کے ساتھ گفتگو کے بغیر اس کی شخصیت کا اندازہ لگانے کے لیے اس کے لباس اور زبان کے لہجہ پر توجہ دیتے ہیں۔ انگریزوں کی اپنی سوسائٹی انڈر کلاس، لوتھر کنگ کلاس، ورکنگ کلاس، لوتھر مڈل کلاس، مڈل کلاس، ہائی مڈل کلاس اور ہائیسٹ کلاس میں تقسیم ہے۔ انڈر کلاس وہ ہیں جن کا کوئی گھر نہیں۔ لوتھر کنگ کلاس دہاڑی دار لوگ ہیں جن کی کوئی پکی نوکری نہیں۔ ورکنگ کلاس فیکٹری اور کرہی ہیں جن کی نوکری تو پکی ہوتی ہے لیکن کوئی ہنر نہیں ہوتا۔ لوتھر مڈل کلاس وفتروں کے چھوٹے ملازم جیسے کلرک وغیرہ۔ مڈل کلاس تعلیم یافتہ پیشہ ور لوگ جیسے وکیل، ڈکٹر اور معلمین۔ ہائی مڈل کلاس اداروں کے سربراہ اور ٹاپ کلاس رائل فیلی جن کی کلاس کبھی تبدیل نہیں ہوتی۔ سب سے چکدار کلاس مڈل کلاس ہے جو ایسے تعلیم یافتہ لوگ ہوتے ہیں جو محنت کے بل ہوتے پر ترقی کر جاتے ہیں۔ ایک تحقیق کے مطابق مڈل کلاس انگریز انگریزوں کی دوسری کلاسوں کے لوگوں کی نسبت دوسرے معاشرے سے تعلق رکھنے والے ہم کلاس لوگوں کے ساتھ زیادہ مطمئن رہتے ہیں چاۓ ان کا کوئی بھی رنگ نسل اور مذہب ہو۔ میری اپنی زندگی کے تجربات اس سوچ کی تصدیق کرتے ہیں۔ میں جس بھی یورپی ملک میں گیا تو میری سب سے زیادہ تعلیم یافتہ یورپین نے مدد کی جو صرف اس بات پر خوش تھے کہ میں ان کی زبان سیکھ رہا ہوں۔ مجھے جیسے بے وسائل انسان کو جرمی کے لئے اور اما، گوئے انسٹیٹیوٹ اور فرانس میں اسکفروڑ کی ہم پلے سور بورن یونیورسٹی تک لے

جانا مل کلاس مغربی دوستوں کے تعاون سے ہی ممکن ہوا۔ فرانس میں مجھے پروفیسر بورس ملے جنہوں نے پریس دولا فرانس ایجنسی کے ڈائریکٹر، سب سے بڑے روزنامہ لوموند کے چیف ایڈٹر اور جرمی کے سب سے بڑے شاعر گولٹے انسٹیٹیوٹ کی ڈائریکٹر روزویٹا سے میرا تعارف کروایا۔ روزویٹا نے مجھے بتایا کہ وہ ہر سال اضافی چھٹیاں لے کر گرمیوں کے تین ماہ سرینگر گزارتی ہیں۔ انہوں نے مجھے ایک گلو بند تختے میں دیا جو گرفتاری کے وقت میں نے پہن رکھا تھا۔ اس پر لیبرٹی کا نشان تھا تو بڑش پریس نے اس پر کئی گھنٹے مجھ سے پوچھ چکھ کی کہ میں نے لیبرٹی کے مارک والا مفلکر کیوں پہن رکھا ہے۔ انسان پر جب برا وقت آئے تو اس کی خوبیوں کو بھی اس کے خلاف استعمال کیا جاتا ہے۔ گرفتاری کے وقت میرے پاس دوران سفر برطانیہ کا ٹائمز اخبار تھا۔ استغاش نے یہ اخبار ہوا میں لہراتے ہوئے جیوری سے پوچھا کہ مبزر آف دی جیوری اپکو پتہ ہے برطانیہ میں کون تی کلاس کو نسا اخبار پڑھتی ہے۔ سن اور میل کو درنگ کلاس، گارڈین کو ڈل کلاس اور ٹائمز کو ٹاپ کلاس پڑھتی ہے۔ یہ کشمیری جو آپ کے سامنے کھڑا ہے یہ کوئی عام انسان نہیں، اعلیٰ تعلیم یافت ہے۔ اس کاٹھرے میں جو چکھ کشمیری آپ کو نظر آ رہے ہیں ان کی دنیا ایک دن عزت کرے گی لیکن ہم نے ان کے عمل کو آج اپنے قانون کے ترازوں سے تو نا ہے۔ میرے بیڑڑ لارڈ گفورڈ نے کہا میرے بے چارے پر دیسی موکل مستر راجہ کو پریس نے مرضی کے وکیل تک رسائی کا حق نہیں دیا تو نج نے مداخلت کرتے ہوئے کہا یہ بے چارہ کیسے ہو گیا۔ مجھے صرف انگریزی آتی ہے اور راجہ غیر ملکی ہو کر بھی یورپ کی چارز بانیں بولتا ہے۔

گویا ایسے حالات میں انسانی کی خوبیوں کو بھی ہتھیار کے طور پر اس کے خلاف استعمال کیا جاتا ہے لیکن عام حالات میں انگریز انسان کی لگن صلاحیت اور محنت کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ یورپ بھر میں عام لوگوں کے اندر انسانی قدریں پائی جاتی ہیں۔ میں ہالینڈ میں اپنے بھائی کے پاس جب رہتا تھا تو ایک گلی سے گزر رہتا تھا کہ برف نے زور پکڑ لیا۔ اس گلی میں کوئی کیفے یا لیسٹورنٹ نہ تھا جہاں میں پناہ لے سکتا۔ ایک مکان کی شیڈ کے نیچے میں کھڑا ہو گیا لیکن آندھی اور طوفان میں وہاں زیادہ دیر کھڑا رہنا ناممکن تھا۔ مختلف سمت کی تیسری منزل کی کھڑکی کھول کر ایک درمیانی عمر کی خاتون نے مجھے اوپر آنے کا اشارہ کیا۔ اس کے گھر میں داخل ہوا تو میرے کپڑے مکمل طور پر بھیگ چکے تھے۔ اس کا خاوند بھی گھر موجود تھا جس نے مجھے اپنے کپڑے دیے اور انہوں نے فوری طور پر میرے کپڑے خشک کرنے کے لیے ہیٹر پر ڈالے۔ مجھے ہیٹر کے سامنے بٹھا کر فوری طور پر گرم سوپ دیا اور بھر قوئی پیش کی۔ جرمی میں ایک دفعہ اپنی کار پر دوسرے شہر سے واپس سٹڈی گارٹ جا رہا تھا کہ میری

کار برف میں پھنس گئی۔ میں پریشان ہونے لگا کہ اب اس جنگل میں اکیلے میری رات کیسے گزرے گی کہ اتنے میں ایک امریکی میاں بیوی فرشتہ بن کر آئے۔ وہ برف میں پھنسی میری کارڈ کیچ کر رک گے۔ وہ دونوں جرمی میں موجود امریکی فوجی اڈے پر تعینات تھے۔ انہوں نے اپنی یونٹ سے رابطہ کر کے رسکیو کوفون کروا یا جو میری گاڑی کو رکشاپ میں لے گئی اور امریکی جوڑا کوئی ڈیڈھ گھنٹے کی ڈرائیور کے مجھے میرے گھر پہنچوڑ آیا۔ ایسے انسان پنڈ لوگوں کی یادیں شہد سے بھی زیادہ یقینی ہیں۔ کاش قوموں کی حکمرانی ایسے لوگوں کے پاس ہوتا دنیا یا پر محبت اور امن کا گھوارہ بن جائے۔

انگریزوں کے اصول اور دلنش؟

انگریزوں کے سیاسی نظام پر جہاں میں نے تنقید کی ہے وہاں اصول کا تقاضا ہے کہ ان کی خوبیوں اور دلنش کا بھی زکر کروں۔ عام انگریز اپنی حکومتوں کی غلط پالیسی پر اپنے حکمرانوں کے خلاف کھڑے ہو جاتے ہیں جس طرح حال ہی میں غزہ پر اسرائیلی بمباری کے وقت اپنی حکومت کے خلاف ڈٹ گئے اور عراق پر امریکی حملہ کے وقت امریکی صدر بیش کا ساتھ دینے پر مقبول ترین برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلر کو استعفی پر مجبور کر دیا۔ برطانوی نظام میں احتساب کا عمل اتنا خست ہے کہ جو قومی نقصان کرے گا وہ احتساب سے نفع نہیں سکتا۔ برطانویہ کی تاریخ میں موت کے بعد بھی کئی افراد پر مقدمات چلے ہیں۔ اسی لیے کسی کو قومی مفاد کے خلاف کام کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ انگریزوں کی دوسرا بڑی خوبی رابطہ کاری کی اہمیت کا دراک ہے۔ ان کے کسی بھی ادارے کی کسی بھی بڑی شخصیت کو خط لکھا جائے وہ جواب دیتے ہیں۔ وہ ہر حال میں قومی وقار کا خیال رکھتے ہیں۔ اس کی خاطر وہ اپنے رویوں کو حسب ضرورت زم بھی کر لیتے ہیں۔ میرا آخری بیان ریکارڈ کرنے کے لیے نجی جیل میں آیا تھا۔ اس نے میرے ساتھ ہونے والی زیارتیوں کی وجہ سے میرا روپہ زم کرنے کے لیے میرے ریکارڈ کا ذکر کرتے ہوئے میری تعریفوں کے پل باندھے اور کہا کہ اس نے اپنے کئی یہ میں کسی قیدی پر لکھی گئی اتنی اچھی رپورٹ نہیں پڑی۔ بیتھ روانہ پورٹ سے جب سیکورٹی ٹیم کا تبادلہ ہوا تو ایک خاتون افسر نے پوچھا: آپ انگلینڈ کی کوئی آخری یاد ساتھ لے جانا چاہتے ہیں؟ میں سوال کی وجہ پر سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے لپک کر میرے گال پر بوسدے دیا اور کہا یہ ہوگی آپ کی آخری یاد۔ ان کی کوشش تھی کہ میں گھر پہنچ کر ان کے خلاف بیان بازی نہ کروں۔ یہ سب کچھ قومی وقار کے لیے تھا۔

آخری باب

مقبول بٹ شہید کے ساتھی اور پیروکار

مقبول بٹ شہید، ان کے نظریات، ساتھیوں اور پیروکاروں پر مجھے شروع میں لکھنا چاہیے تھا لیکن میں نے سوچا کہ پہلے ان کی رہائی کی کوششوں اور ان کوششوں کی ناکامی کی وجوہات کا تذکرہ کر لوں تا کہ قارئین اور خاصلکنو جوان نسل یہ فیصلہ کرنے کے مقبول بٹ کے حقیقی ساتھی اور پیروکار اور انکے نظریاتی وارث کون ہیں؟ نوجوان نسل کے لیے یہ جانتا ضروری ہے تاکہ ان کے اندر سے ایک ایسی جاندار قیادت سامنے آئے جسے کوئی دوسرا خرید سکے نہ کسی حادثے کا شکار کر سکے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے نوجوانوں کے اندر سیاسی سفارتی اور عسکری صلاحیتیں پیدا ہوں اور وہ دنیا کے ساتھ کسی وکیل و سفیر کے بجائے براہ راست خود انتخاب ہو سکیں۔ مقبول بٹ شہید 18 فروری 1938ء کو تریکام بھارتی مقبوضہ کشمیر میں پیدا ہوئے۔ بی اے سرینگر اور ایم اے اور قانون کی ڈگریاں پشاور سے حاصل کیں جہاں وہ 1958ء میں اپنے آبائی وطن سے بھرت کر کے آئے۔ مقبول بٹ کے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہیں۔ مقبول بٹ کی اسیری کے دوران بڑے بیٹے جاوید بٹ نے ایگر لیکچر اور چھوٹے بیٹے شوکت بٹ نے قانون کی ڈگری لی۔ جب کہ بیٹی بیٹی بٹ نے ایم اے تحریک کو سیاسی و عسکری طور پر منظم کرنے کے لیے وہ وطن واپس گئے جہاں بھارتی بارڈ فورس نے ان کا تعاقب کیا۔ ان کے ساتھ گلگت کے اور گلگت زیب تھے۔ بھارتی فورس نے ان کو گرفتار کرنے کی کوشش کی۔ بھارت کا انپکٹر امر چند جھٹپٹ میں مارا گیا۔ انیں سالہ اور گلگت زیب شہید ہو گیا اور مقبول بٹ گرفتار ہو گے۔ مقدمہ چلاتو مقبول بٹ شہید کو پچانی کی سزا ہوئی۔ دو سال بعد وہ اپنے ساتھیوں صوبیدار کالا خان، میر احمد اور چوہدری غلام یاسین بڑھانہ سرینگر جیل سے سرنگ کھود کر فرار ہو گے۔ آزاد کشمیر پہنچنے پر پاکستان آرمی کے

ہاتھوں گرفتار ہوئے مگر عوامی احتجاج کے نتیجے میں بری کردیے گئے۔ یہاں سیاسی جدوجہد جاری رہی۔ 1971 میں مقبول بٹ شہید کے پیر و کاروں ہاشم قریشی اور اشرف قریشی نے گنگا جہاز انواع کیا۔ پہلے پاکستان میں ان کا استقبال کیا گیا اور بعد میں مشرقی اور مغربی پاکستان کی سیاسی جنگ کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ مقبول بٹ شہید یہ جانتے ہوئے بھی کہ بھارت نے ان کو پھانسی کی سزا دی ہوئی ہے، وہ دو نوجوانوں عبدالحمید بٹ اور ریاض ڈار کو ساتھ لے کر دوبارہ بھارتی مقبوضہ کشمیر چلے گے۔ مشن ایسا تھا کہ آخر کسی نہ کسی مرحلہ پر گرفتار ہوئی جانا تھا۔ 1976 میں گرفتاری کے نتیجے میں کشمیر سے تہاڑ جیل سریگر منتقل کر دیے گے۔ جموں کشمیر فریڈم مومنٹ کے کمانڈر عبدالحمید دیوانی کی قیادت میں چھ جوانوں نے بھارتی طیارہ انواع کر کے لاہور لایا جہاں ایک بار پھر کشمیری دھوکے کا شکار ہوئے اور عبدالحمید دیوانی نے اس تاریخی موقع پر یہ شعر پڑھا::

نشہ پلا کے گرانا تو سکو آتا ہے
مرا تو تب ہے کہ گروں کو تھام لے ساقی

مقبول بٹ شہید کے ساتھ میری خط و کتابت جرمی اور فرانس سے ہوا کرتی تھی۔ مجھے تو انہوں نے پھانسی پر عمل درآمد کا کوئی اشارہ نہ دیا لیکن جب کرسمس کی چھٹیوں پر میں انگلینڈ گیا تو امان اللہ خان نے کہا کہ مقبول بٹ کو خاموشی سے پھانسی دی جانے والی ہے۔ ہم نے یہ سوچ کر یقین کیا کہ امان اللہ خان مقبول بٹ کے دیرینہ ساتھی ہیں اور ان کے پاس معلومات کے اور بھی بہتر ذرائع ہوں گے۔ جولائی 1983 میں جب میں برطانیہ گیا جہاں لوٹن میں امان اللہ خان کی دعوت پر تیرہ جولائی 1931 کے شہداء کشمیر کانفرنس میں بھی شرکت کی۔ اس دوران امان اللہ خان نے ڈاکٹر فاروق حیدر اور ہاشم قریشی کے نام ایک ڈرافٹ لیٹر کھایا جس میں کشمیر لبریشن اری کے قیام کا زکر تھا۔ جب میں نے امان اللہ خان سے پوچھا کہ برطانیہ میں کشمیر لبریشن اری کیسے کام کرے گی اور اس کے ابتدائی اراکین کون ہیں تو امان اللہ خان نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ میں سیاسی ونگ کے لیے زیادہ موزوں ہوں۔ یہ اضافہ بھی کیا کہ مجھے یورپ کی متعدد بانیں آتی ہیں اور میرے کشمیری اور غیر کشمیری افراد سے جو روابط ہیں انہیں مزید مضبوط کروں۔ ظاہر وہ ٹھیک کہہ رہے تھے لیکن بعد میں مجھے اندر ہرے میں رکھ کر مہاترے کیس میں پھنسا دیا۔ میرا پا سپورٹ ہوم آفس میں تھا۔ اس لیے مجھے زیادہ دیر تک

سفر تکار کے پاس نہیں رہنا تھا۔ میر اخیال تھا کہ میں سفارتکار سے بھارتی وزیر اعظم اندر اگاندی کے نام مقبول بٹ کی رہائی کی اپیل لکھواد کر سا منے آ جاؤ گا اور مجھ پر کسی کوشش نہیں ہو گا لیکن جس ادمی نے ریاض ملک کے ساتھ سفارتکار کے پاس رہنا تھا اس کا بعد میں معلوم ہوا کہ وہ آیانہ آنا تھا۔ سفارتکار سے اندر اگاندی کے نام مقبول بٹ کی رہائی کی اپیل تو میں نے لکھوادی لیکن اب میر اضیرا جاگز نہیں دے رہا تھا کہ میں بیس سالہ معصوم ریاض ملک کو اکیلا چھوڑ کر کھسک جاؤں۔ یہاں یہ بھی واضح کرتا چلوں کہ اغواء کاروں نے مہاترے نہیں بلکہ اس کے سینتر قولي کو پکڑنا تھا۔ یہ کاروائی دو فروری بروز جمعرات شام چھبجے کے قریب عمل میں لائی جانی تھی۔ سردیوں میں چھبجے یورپ میں گپ اندر ہیرا ہوتا ہے۔ اس لیے یہ وقت مناسب سمجھا گیا۔ تین اغواء کار جب واپس آئے تو ساتھ قولي نہیں مہاترے تھا جو زخمی تھا۔ اسلم مرزا اور صدیق بھٹی غائب ہو گئے جبکہ تیسرا جورنگ لیڈر تھا اس نے واپس آنا تھا اور اس کی واپسی پر میں نے منظر عام پر آ جانا تھا مگر وہ واپس آنے کے بجائے امان اللہ خان کے پاس چلا گیا۔ امان اللہ نے بھارتی سفارت خانہ اور پولیس کوفون کر کے خود کو رضا کارانہ طور پر بطور ثالث پیش کر دیا۔ پولیس امان اللہ خان کے گھر گئی جہاں سے امان اللہ اور ہاشم کو گرفتار کر کے تھانے بنڈ کر دیا گیا۔ امان اللہ خان ساری زندگی ناشکری کا مظاہرے کرتے ہوئے ان کو بچانے والے نوجوانوں پر مہاترے کیس میتھ کرنے کا الزام لگاتے رہے لیکن مس میتھ امان اللہ خان نے کیا جنمیں پیلسی کا شوق تھا۔ اگر امان اللہ خان خاموشی سے اپنے گھر بیٹھ رہتے تو پولیس لبریشن فرنٹ کے ہیڈ کوارٹر میں اس وقت کے سیکرٹری جzel زیر انصاری کے پاس ہی رہتی اور اگر کسی موقع پر امان اللہ خان سے پوچھنچ ہوتی بھی تو جس طرح باقی سینتر رہنماؤں نے بے خبری کا ظہار کیا تھا اس طرح امان اللہ خان بھی مختصر سا جواب پولیس کو دے کر بچ سکتے تھے لیکن ان کا پلان پہلے سے طے شدہ تھا۔

امان اللہ خان کے گھر مقبول بٹ شہید کی رہائی کی کوشش کے منصوبے پر جب مشاورت ہو رہی تھی تو ہاشم قریشی جو پلان پیش کر رہے تھے وہ سفارتکار کے اغواء سے بہت بڑا تھا۔ امان اللہ خان ہاشم کے پلان کی مخالفت کر رہے تھے کیونکہ ان کا اپنا خفیہ پلان تھا اور وہ تھا سفارتکار کو اغوا کر کے قتل کروانا۔ مجھے قتل سے اس لیے بے خبر کھا گیا کہ میں ایک دفعہ کوٹی کے عبدالکریم بٹ اور ایک دفعہ ایک اور ساتھی کو قتل کے ارادہ سے روک چکا تھا جس کی وجہ سے اس بار امان اللہ نے دوسرے دونوں جوانوں کو

بتایا کہ وہ میرے ساتھ قتل کے ارادے کا ذکر نہ کریں۔

مقبول بٹ شہید صرف ایک گوریالا لیڈر ہی نہ تھے بلکہ ایک سیاسی مفکر، بہترین مقرر اور قلم کار بھی تھے۔ وہ ظالم، جابر، منافق اور استھانی طبقوں کے خلاف تھے۔ مقبول بٹ کی سیاسی لائی اور دوست و دشمن کے درمیان فرق بالکل واضح تھا۔ مقبول بٹ کے نزدیک ہر وہ قوت ہماری دشمن تھی جو ہماری مکمل آزادی و مختاری کے خلاف تھی اور ہر وہ قوت ہماری دوست تھی جو ہماری آزادی کی حادی تھی جبکہ امان اللہ خان جو صرف ایک قلندر تھے وہ ان ظالموں، جابروں، منافقوں اور موقع پرستوں کے ساتھ ہر وقت تعلق بنانے کی کوشش میں رہتے تھے جس کا سب سے بڑا ثبوت الحاق پند جماعتوں سے اتحاد اور آزادی پسند تنظیموں کے ساتھ اتحاد کی مخالفت تھی۔ وہ اپنے باصلاحیت ساتھیوں سے وقق کام کرواتو لیتے تھے لیکن عہدے نالائق یا غیر متحرک لوگوں کو دیا کرتے تھے تاکہ وہ من پسند فیصلے کر سکیں۔ وہ صاحب فکر اور صاحب کردار کی نسبت صاحب اقتدار کو اہمیت دیتے تھے۔ راجہ مظفر صاحب کو امان اللہ خان نے اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ میں ابھی جیل میں تھا کہ راجہ مظفر صاحب امریکہ چلے گے۔ ایک مرتب انہوں نے برطانیہ دورہ کے دوران مجھ سے ملاقات بھی کی۔ جیل میں منحصر ملاقات میں راجہ مظفر صاحب کے بارے میں کوئی حقیقی رائے قائم نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن یہ سوال میرے ذہن میں ضرور گردش کرتا تھا کہ انہوں نے بھی کبھی اس سوال کو اہمیت نہ دی کہ مہاترے کے انواع کا مقصد اگر مقبول بٹ شہید کی رہائی کی مخلصانہ کوشش تھی تو پھر مہاترے کو فوری کیوں مردا دیا گیا۔ راجہ مظفر صاحب امریکہ چلے گئے تو امان اللہ خان نے لکھا کہ جس ادمی کو انہوں نے اپنی جانشینی کا رتبہ عطا کیا اس نے اپنی بہت کم قیمت لگائی۔ چونکہ امان اللہ خان یاسین ملک کے ساتھ اختلافات پر بھی بارہ سال تک انہیں بھارتی خفیہ ایجنسی را کا ایجنسٹ کہتے رہے اور پھر اچانک اپنے دھڑے سے مشاورت کیے بغیر ان سے اتحاد کر لیا، میں امان اللہ خان کے بیان کی بنیاد پر راجہ مظفر یا کسی بھی شخص بارے میں اپنی رائے قائم نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن دو ایسے واقعات ہوئے جنہوں نے مجھے راجہ مظفر صاحب بارے بھی ما یوس کیا۔ اول، بھارتی وزیر اعظم مودی نے یاسین ملک کے خلاف تیس سال پر ان کیسیں بحال کر کے ان کو پچانسی پر لاٹکانے کی نیت سے جب ان کو گرفتار کیا تو لبریشن فرنٹ کو متعدد مضبوط کرنے کی ضرورت تھی لیکن عہدوں کی جگہ نے جماعت کو ایک بار پھر تقسیم کر دیا۔ جسکوں کا دھرنا بھی

جماعت کے اندر ونی اختلافات کا سبب بنا۔ میں نے شروع میں ہی کہہ دیا تھا کہ یہ مارچ اور دھرنا غیر متعین خیز ثابت ہو گا جو درست ثابت ہوا۔ فرنٹ اور یاسین ملک کے ترجمان رفیق ڈار کا چونکہ تعلق بھارتی مقبوضہ کشمیر سے تھا، راجہ مظفر صاحب اور چند ڈیگر افراد نے ویلی سے تعلق رکھنے والے الاطاف قادری کو امریکہ میں باغی گروپ کا سربراہ بنا دیا جس کا میرٹ صرف ویلی سے تعلق تھا۔ نئی دھڑے بندی سے پہلے یہ دونوں دھڑے میرے خلاف تھد تھے اور میرا قصور صرف مہاترے قتل کی انکوائری کا مطالبہ تھا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید خوش ہوتا کے اس کے مقابلہ اب اپس میں لٹڑ پڑے ہیں لیکن مجھے بہت دکھ ہوا۔ میں نے پس پر دو دو نوں دھڑوں کو متعدد کرنے کی کوشش کی جس کا ریکارڈ موجود ہے۔ میرا یہ بھی خیال تھا کہ الاطاف قادری زیادہ دینیں چلیں گے اور میرا یہ تجزیہ بھی اس وقت درست ثابت ہو گیا جب قادری صاحب نے کچھ عرصہ بعد استغفار دے دیا۔ میں اپنے طور پر کئی سالوں سے سفارتی مجاز پر متحرک تھا۔ راجہ مظفر صاحب اپنے دھڑے کی بیرون ملک سفارتی نمائندگی کرنے لگے۔ میں جب بھی کسی سفارتکار سے اسلام آباد ملتا تو راجہ مظفر صاحب کے ساتھ معلومات شیئر کرتا لیکن راجہ مظفر صاحب نے ہمیشہ امان اللہ خان والا طریقہ اپنایا اور وہ یہ کہ متحرک اور آزمودہ کار ساتھیوں کے ساتھ مشاورت کے مجاہے دو تین افراد سے مل کر خفیہ فیصلہ کر کے باقی سب سے فیصلہ قبول کرنے کی توقع کی۔ میں نے تو کم عمری میں بھی امان اللہ خان کے ایسے طرز عمل کی مخالفت کیا کرتا تھا جبکہ اب تو ہمارے پاس چالیس سالہ تجربہ ہے۔ امان اللہ خان کی طرح راجہ مظفر بھی صاحب اقتدار کشمیری لیڈروں سے قربت کا شوق رکھتے ہیں۔ وہ سردار ابرہیم خان اور سردار قیوم خان کی برسیوں پر ان کے حق میں کالم بھی لکھتے رہتے ہیں۔ اچمل تیموری اور کئی اور دوسرے دوست بتاتے ہیں کہ مقبوضہ کشمیر سے آنے والے تحریکی لوگوں کے حوالے راجہ مظفر صاحب کی بیگم اور بیٹی کی بھی کافی خدمات ہیں۔ ان کی ایک کزان نیلم فیروز راجہ جو ٹھیکیدار راجہ فیروز خان کی صاحبزادی ہیں وہ کوٹلی میں ڈسٹرکٹ ایمپوشن افسر رہی ہیں۔ محکمہ تعلیم میں ان کو ریٹائر ہو جانے کے بعد بھی بڑے احترام سے یاد کیا جاتا ہے۔ راجہ مظفر صاحب کے خاندان کی دیگر کئی شخصیات کو بھی میں جانتا ہوں۔ اس خاندان کی اپنی ایک بیچان ہے۔ اس لیے مجھے نہیں معلوم کہ راجہ مظفر صاحب مقبول بٹ کا ساتھی ہونے کے ساتھ سردار ابرہیم اور سردار قیوم جیسے تنازعہ لوگوں کی تعریف کر کے خود کو کیوں تنازعہ بنارہے ہیں؟

مقبول بٹ شہید کی چھانسی کے وقت برطانیہ میں فرنٹ کے صدر و میکر ٹری افضل جاتلوی اور شیبیر چوہدری تھے جبکہ آزاد کشمیر زون کے صدر سردار رشید حضرت تھے۔ ہاشم قریشی مقبول بٹ کے پکے اور پر جوش پیر کار کے طور پر مشہور تھے۔ جیرت ہے کہ جب مقبول بٹ شہید کی رہائی کی کوشش کے طور پر پکڑے جانے والے بھارتی سفارت کار مہما ترے کو قتل کروانے کا الزام امام اللدھان پر لگا اور میں نے انکو اری کا مطالبہ کیا تو ڈاکٹر فاروق حیدر اور ہاشم قریشی کے علاوہ مقبول بٹ کے سب نام نہاد مذکورہ ساتھیوں اور پیر و کاروں نے انکو اری کی مخالفت کی جس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مقبول بٹ کے حقیقی ساتھی اور پیر و کار کون تھے؟ یہ باتیں زیر بحث لانے کی متعدد وجوہات ہیں۔ ایک وجہ یہ ہے کہ بے شمار لوگ مقبول بٹ شہید کا ایک طرف نام استعمال کرتے ہیں تو دوسرا طرف ان کی چھانسی کے متعلق یہ سوالات اٹھانے والوں اور عملی قربانیاں دینے والوں کے خلاف بے بنیاد پروگنڈا کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مقبول بٹ کے نقش قدم پر چلنے والے بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں کو نہیں سمجھتے اس لیے یہ کسی بھی گروپ میں ایڈ جسٹ نہیں ہوتے جبکہ عملی قربانیاں دینے والے بہت کچھ دیکھ چکے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے قربانیاں آزادی کے لیے دی ہیں نہ کہ دھڑے بندیوں کے لیے۔ کامیاب اور باشمورتوں میں تجربہ کار افراد کو ریٹائر ہو جانے پر بھی انہیں بے کار نہیں سمجھتیں بلکہ ان کے تجربات سے استفادہ کرنے کے لیے انہیں مختلف فورمز پر دعوت دیتی ہیں تاکہ نوجوان نسل ان کے تجربات و مشاہدات سے رہنمائی حاصل کرے۔ امریکہ میں کینیڈی فورم، روس میں گور باچوف فورم، جرمنی میں گوٹے انسٹیٹیوٹ، فرانس میں پیرس انسٹیٹیوٹ آف پولیٹکل سٹڈیز، بھارت، چین، ترکی اور ایران میں بھی اسی طرح کے ادارے موجود ہیں جبکہ ہمارے ہاں شخصیات کے نام پر صرف سیاست کی جاتی ہے لیکن ان کے افکار پر عمل نہیں کیا جاتا۔ ہمارا موقف ہے کہ مقبول بٹ کی قربانی کی قدر کا اصل طریقہ ان کے مشن کی تکمیل کے لیے اتحاد و اتفاق اور ان کے مشن کی تکمیل کے لیے عملی جدوجہد کرنے والوں سے سیکھنے کی ضرورت ہے۔ جو لوگ اتحاد بھی نہیں کرتے اور مقبول بٹ کے نظریہ پر عملی قربانی دینے والوں کو قبول بھی نہیں کرتے وہ کیسے خود کو مقبول بٹ کا پیر و کار قرار دے سکتے ہیں؟ مسئلہ میری ذات کا نہیں بلکہ تحریکی مفادات کا ہے۔ تقسیم در تقسیم کا سلسہ دیکھ کر اپنے بیگانے سب ہمارا مذاق اڑاتے ہیں جس کی تکلیف عملی قربانیاں دینے والوں کو نہیں تو اور کس کو ہوگی؟ یوں تو حدیث بھی ہے کہ

اسلام پر چلنے کے لیے نبی کے بعد ان کے صحابہ اکرم اور اس کے بعد اور پھر ان کے بعد آنے والوں کی پیروی کی جائے لیکن کسی کی نظر یا تی پختگی اور اخلاص پر کھنے کے لیے بھی فہم عامہ یہی کہتا ہے۔ جن لوگوں کو تھاڑ جیل میں دفن مقبول بٹ شہید اپنے لگتے ہیں انہیں مقبول بٹ کے نظر یا تی وارث قبول ہیں نہ مقبول بٹ کے خاندانی وارث؟ وہ کسی تقریب و تقریر میں مقبول بٹ کے نظر یا تی و خاندانی وارثوں کا ذکر تک نہیں کرتے لیکن اپنے نام مقبول بٹ کے خطوط بار بار سو شل میڈیا پر شیر کرتے ہیں۔ جہاں تک میری زات کا تعلق ہے تو میں اس وقت بولنے پر مجبور ہو جاتا ہوں جب مقبول بٹ شہید کی ہر برسی پر کچھ لوگ امان اللہ خان پر مہاترے قتل کا الزام لگاتے ہیں اور ان کے دفاع میں ان کے حامی امان اللہ خان کے اس بیان کا حوالہ دیتے ہیں جس میں موصوف نے کہا تھا کہ نوجوانوں نے انواع کا کیس مس حینڈل کیا جبکہ مس حینڈل امان اللہ خان نے کیا تھا جنہوں نے خاموشی سے گھر پیٹھ کر صورت حال کا جائزہ لینے کے بجائے پولیس اور بھارتی سفارت خانے کو ٹالشی کی پیش کش کر دی۔ پولیس نے امان اللہ خان کے گھر جا کر ان کو رفاقت کر لیا جہاں سے مس ہینڈل نگ شروع ہوئی۔ اگر امان اللہ خان اپنی غلطی کا اعتراف کرنے کے بجائے ہم پر الٹا الزام لگا سکیں جنہوں نے امان اللہ سمیت جماعت کا دفاع کیا تو پھر حقیقت پسند لوگ اتفاق کریں گے کہ مجھے اور میرے ساتھیوں کو بھی اپنے دفاع کا حق حاصل ہے۔ میں نے تین جون 1985ء کو برطانیہ کی فریانک لینڈ جیل میں امان اللہ خان سے کہا تھا کہ مجھے بتائیں کہ آپ کو مہاترے قتل کروانے کی کیوں جلدی تھی؟ میں نے اس وقت یہ بھی کہا تھا کہ ابھی تک میرے الفاظ جیل کی دیواروں کے اندر ہیں، اگر بار بار چلے گئے تو قبر میں بھی آپ کا پیچھا کریں گے۔ آج چالیس سال بعد جلوسوں، چوکوں چراوں اور میڈیا میں ہر تیسرے بندے کی طرف سے پوچھا جانے والا میرا وہی سوال میرے اس وقت کے انتہا کو درست ثابت کر رہا ہے۔ وقت ہے کہ مٹی پاؤ کی پالیسی سے چھکارہ حاصل کر کے وہ سارے لوگ معافی مانگیں جنہوں نے مقبول بٹ کی جان بخشی کی کوشش کو ناکام کرنے والوں کا دفاع کیا۔ غلطیاں انسانوں سے ہوتی ہیں لیکن خود احتسابی اور توہاب ایسا عمل ہے جو انسان کوئی زندگی عطا کر دیتا ہے۔

نظر حیات پر رکھتا ہے مرد دانش مند
حیات کیا ہے حضور و سرور و نور و وجود

امان اللہ خان اور خفیہ اداروں کو اللہ تعالیٰ کا جواب:

امان اللہ خان کے مخالفین نے موقع غنیمت جانتے ہوئے میری گرفتاری پر مجھے ترغیب دی کہ مہاترے کیس امان اللہ خان نے سبتوتاڑ کیا اور آپکو بھی اسی نے گرفتار کروایا لہذا آپ بھی پولیس کو بیان دے کر امان اللہ خان کو گرفتار کروادیں۔ میں نے اس تجویز کو اسی وقت رد کر کے کہا تھا کہ لبریشن فرنٹ کو پارٹی سطح پر اس کی تحقیقات کرنی چاہیے لیکن امان اللہ خان یا کسی بھی کشمیری کو پکڑوانے سے تحریک و تنظیم، میں خود اور میرا خاندان بدنام ہوں گے۔ میں نے واضح کیا کہ عدالت میں جب ہم کشمیری ایک دوسرے کے خلاف اپنے دفاع میں بیانات دیں گے تو ہم سکی اجتماعی بدنائی ہو گی۔ اس واقعہ کے چند سال بعد حماز رائے شماری کے صدر جناب عبدالخالق انصاری صاحب برطانیہ کے دورہ پر گئے تو مجھے بھی جیل میں ملے۔ اس دوران ان کے ایک ہمراہی نے امان اللہ خان کے خلاف بیان کی تجویز پھر دہرائی تو خالق انصاری صاحب نے اس ادمی کو ڈاٹ دیا اور میرے فیصلے کی تعریف کی۔ میں بھی خالق انصاری صاحب کی دوراندیشی پر خوش ہوا لیکن امان اللہ خان نے پھر بھی تنگ نظری، اور احسان فراموشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی کتاب، تحریکوں اور تقریروں میں میرے خلاف غلط بیانی کی میں نے جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کی سینیٹل کمیٹی سے درخواست کی کہ وہ تحقیقات کرے کہ اگر مہاترے کا انواع مقبول بٹ کو پھانسی سے بچانے کی کوشش تھی تو اسے عجلت میں کیوں قتل کیا گیا؟ امان اللہ خان نے لبریشن فرنٹ کو کہا کہ راجنو جوان ادمی تھا۔ جیل ہو گئی اور ڈپریشن کا شکار ہو گیا ہے۔ یہ بات انہوں نے اپنی کتاب جہد مسلسل کی پہلی جلد میں بھی لکھی جسے صرف میری انکوائری کی درخواست کو دبانے والوں نے ہی نہیں اچھلا بلکہ ۲۲ سال بعد میری رہائی کی خبر پر پاکستان کے خفیہ اداروں نے میرے گھر جا کر میرے بھائی سے بھی پوچھا کہ کیا یہ افواہ درست ہے کہ راجہ قیوم ذہنی طور پر ٹھیک نہیں۔ میرے بھائی نے جواب دیا کہ قیوم راجہ جلد بری ہو کر وطن واپس پہنچنے والے ہیں تو تم خود فیصلہ کر لینا کہ پاگل قیوم راجہ ہے یا اسے پاگل کہنے والے۔ یہ افواہ امان اللہ خان نے کچھ نادان ساتھیوں کے زریعے اس لیے پھیلائی کہ انہیں خدا شناخت کر میری رہائی پر مہاترے انکوائری کا سوال ایک بار پھر کھڑا ہو جائے گا۔ یہ اندازہ کرنا کسی کے لیے مشکل نہیں کہ امان اللہ خان

کے بیانات کو بنیاد بنا کر میرے گھر جا کر پاکستان کے خفیہ اداروں کی طرف سے پوچھنا کہ قیوم راجہ واقعی پاگل ہے تو۔۔۔ میری فیملی کواس سے کتنی تکلیف ہوئی ہوگی۔۔۔ یہاں میں اتنا کہو نگاہ کہ امان اللہ خان اور مجھے پاگل قرار دینے والوں کو اس دن جواب مل گیا تھا جس دن جبل کے اندر گورنر نے مجھے ڈپریشن کے شکار قیدیوں کی سائیکو تھیر اپی کا تحریری اجازت نامہ دیا تھا جس کی تصویر آج بھی میرے پاس موجود ہے۔۔۔ میرے پاس مہاترے کیس کی ساعت کرنے والے جن سریٹر بر سٹو کے ان ریمارکس اور پرویشن افسر کی نوجوری 1985 کی وہ پورٹ بھی موجود ہے جس میں دونوں نے پولیس اور عدالت سے عدم تعادون کو میری محبت وطنی سے تعبیر کیا۔۔۔ دونوں نے میری شخصیت بارے جو ثابت ریمارکس دیے وہ امان اللہ خان کے ریمارکس سے زیادہ وزنی ہیں۔۔۔ یہ امان اللہ کو اللہ تعالیٰ کا جواب تھا۔ آج چالیس سال بعد بھی میں یہ تو نہیں کہو نگاہ کہ امان اللہ خود پاگل تھا لیکن یہ ضرور پوچھنے کا حق رکھتا ہوں کہ کیا ایسے ادی کو کچھ لوگوں کی طرف سے قائد تحریک کہنا درست عمل ہے؟ (جج کے ریمارکس اور پرویشن افسر کے خط کی کاپی ثبوت کے طور پر کتاب کے آخر میں لیگل دستاویزات میں شامل ہے)

چالیس سالہ تجربات و مشاہدات کی روشنی میں نوجوان نسل کے نام پیغام

ہم نے جس دور اور جس ماحول میں آزادی کا سہانا خواب دیکھا تھا اس دور میں قیادت کے معیار، تعلیم و تربیت، درست سمت کی نشان دہی کا فقدان، روابط کے مسائل اور وسائل کی کمی تھی۔ آزادی کا جذبہ رکھنے والوں کی تعداد بے شک کم مگر اخلاص زیادہ تھا۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ آزادی کے نام لیواں کی تعداد میں اضافہ اور معیار کم ہوتا گیا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ رکنیت سازی کا ناقص طریقہ کار اور پورپی تجزیہ کاروں کی زبان میں کشمیر کی تحریک کو فیملی برس میں تبدیل کرنا تھا۔ انقلابی تحریکوں میں سکرینگ کا جو نظام ہوتا ہے وہ ہمارے ہاں قائم نہ کیا گیا اور نہ احتساب کا نظام قائم ہو سکا جسکی وجہ سے جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کے اندر انفلوئن سی بہت پہلے شروع ہو گئی تھی کہ سن بیساکی میں مجھے لبریشن فرنٹ میں ابھی چند ماہ ہی ہوئے تھے کہ محازارے دوسری بڑی وجہ یہ تھی کہ سن بیساکی میں مجھے لبریشن فرنٹ کے اندر انفلوئن سی بہت پہلے شروع ہو شماری سے جب لبریشن فرنٹ الگ ہو گئی جس کی منصوبہ بندی میری شمولیت سے بہت پہلے شروع ہو گئی تھی لیکن میری طرح نئے ممبران اندر و ان خانہ اختلافات سے لاعلم تھے۔ برطانیہ میں لبریشن فرنٹ

کے دو گروپ بن گئے۔ ایک گروپ کی قیادت امان اللہ خاں اور دوسرا کی جبار بٹ کر رہے تھے۔ جبار بٹ صاحب کی ہمدردیاں مجاز رائے شماری کے ساتھ تھیں۔ ان کے ساتھ پروفیسر نذیر نازش، مشتاق بخشی اور پروفیسر یوسف ثانی جیسے تعلیم یافتہ دانشوروں کو تھے لیکن وہ عام لوگوں کے ساتھ چل سکنے ان کو ساتھ چلا سکے جس کی وجہ سے دن بدن ان کی تعداد کم ہوتی گئی۔ عوام کے اندر پزیرائی نہ پانے کی ایک وجہ ان کی غیر حقیقت پسندانہ اور عوامی جذبات سے ٹکرانے والی سوچ فکر تھی۔ مثال کے طور پر جب برطانیہ میں بھارتی سفارتکار مہاترے اغوا کے بعد قتل کردیا گیا تو بھارتی وزیر اعظم اندر گاندی نے انتقامی طور پر مقبول بٹ کی پھانسی کا اعلان کر دیا۔ مذکورہ دانشوروں نے بھارتی حکومت کے فیصلے کے خلاف جدوجہد کے بجائے ایک جلسے میں اعلان کیا کہ اگر مقبول بٹ کو بھارت پھانسی نہ دے تو وہ مہاترے کے قاتلوں کی گرفتاری میں تعاون کریں گے۔ اگر وہ غیر مشروط طور پر بھارتی فیصلے کی مخالفت کرتے تو عوام ان کا ساتھ دیتے۔ تحریکی میدان میں ایک دوسرا پر سبقت لے جانے کے بجائے تقیدی مقابلہ شروع ہو گیا۔ 2013ء میں میر پور میں میر صدیق صاحب کے دفتر میں ایک اجلاس ہوا۔ مقبول بٹ کے فرزند شوکت بٹ برطانیہ چلے گئے تھے۔ مقبول بٹ کے قائم کردہ پیشسل لبریشن فرنٹ کو پیشسل کافنس میں تبدیل کرنے والے عارف شاہد کو قتل کردیا گیا تھا جس کے بعد کچھ احباب کا خیال تھا کہ پیشسل لبریشن فرنٹ کو بحال کیا جائے۔ میر صدیق صاحب کے دفتر میں ہونے والے اجلاس میں مجھے صدر بنانے کی تجویز پیش کی گئی مگر مشتاق بخشی نے کہا کہ قیوم راجہ بھارتی سفارتکار کے قتل کیس میں قید رہے ہیں۔ ہم نے بھارت کے ساتھ گفت و شنید کی راہ نکالنی ہے لیکن ایسے امور کا اظہار کر رہے تھے لیکن ہماری تحریک کی ناکامی کی ایک بڑی وجہ یہ یہی ہے کہ ہم جن کے ناپسندیدگی کا اظہار کر رہے تھے لیکن ہمارے کچھ لوگ اپنی پالیسی کو بھی انہی کے تابع کر لیتے ہیں۔ خلاف آزادی کی جدوجہد کر رہے ہیں ہمارے کچھ لوگ اپنی پالیسی کو بھی انہی کے تابع کر لیتے ہیں۔ ایسی سوچ فکر کھنے والے کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ دوسری طرف پاکستان نے جب دیکھا کہ آزاد کشمیر کے نوجوان بھی ریاست جموں کشمیر کی بجائی کے لیے عملی طور پر سامنے آگئے ہیں تو پاکستان نے

محسوس کیا کہ اس سے پاکستان کے اس دعوے کی نفع ہوگی کہ آزاد کشمیر کے لوگ پاکستان کے ساتھ خوش ہیں اور مسئلہ صرف بھارتی مقبوضہ کشمیر کا ہے۔ پاکستان نے صورت حال کو نظرول کرنے کے لیے یا سمجھ لیں کہ تحریک کو ہائی جیک کرنے کے لیے امان اللہ خان کو بھارت کے خلاف جدوجہد پر تعاون کا یقین دلایا۔ امان اللہ خان برطانیہ سے واپس آچکے تھے۔ چونکہ میں نے ان کے خلاف مہاترے کے قتل کا حکم دینے کی تحقیقات کا مطالبہ کیا تھا، انہوں نے کراچی سے مجھے جیل میں خاط لکھا کہ میرے الزامات اب روڈی کی ٹوکری میں چلے جائیں گے اور وہ اب موثر انداز میں بھارت کے خلاف جدوجہد کا آغاز کر رہے ہیں۔ مجھے تو پہلے ہی معلوم تھا کہ وہ پاکستان کی مدد کا اشارہ دے رہے ہیں لیکن میر اندازہ اس وقت درست ثابت ہو گیا جب سردار شید حسرت اور شبیر چودھری مجھے فریبک لینڈ جیل میں ملنے گے۔ شبیر چودھری تو پہلے ہی بحیثیت جزل سیکڑی برطانیہ زون میری طرف سے مہاتر قتل کیس کی انکواڑی روک چکے تھے جس میں زون کے صدر افضل جاتلوی بھی پیش پیش تھے، اب سردار شید حسرت بحیثیت صدر بریشن فرنٹ آزاد کشمیر زون بھی تحقیقات کا میر امطالبہ واپس لینے کے لیے مجھے قائل کرنے لگے۔ وہ اس وقت سن چھیساں میں برمنگھم میں کشمیر کا نفرنس میں شرکت کے دیکھا۔ میر ای خدشہ بھی درست ثابت ہوا کہ پاکستان کو ملوث کرنے سے ہماری تحریک دنیا میں علاقائی جگہ اور پر اکسی وار کے طور پر دیکھی جائے گی جس کے نتیجے میں علمی برادری نے جوں ہی پاکستان پر دباؤ ڈالا تو وہ ہماری تحریک کو روک دے گا۔ جزل مشرف نے یہی کیا۔ امان اللہ خان کی سیاسی زندگی سے کم عمر ہونے کے باوجود اگر میں یہ محسوس کر سکتا تھا تو نہ جانے امان اللہ خان کو ادا ک کیوں نہ تھا؟۔ اپنی مدد آپ شروع ہونے والی تحریک کو پر اکسی وار میں تبدیل کر کے ایک لاکھ سے زائد لوگ مردانے اور اس سے زیادہ بے گھر کرنے کے علاوہ کچھ حاصل نہ ہوا۔ چالیس سال قبل ہمارے لوگ سوچتے تھے کہ اگر کشمیری نوجوان جاگ جائیں تو آزادی مل سکتی ہے۔ آج لوگ مایوس ہو کر سوچتے ہیں کہ

کشمیری قیادت نا اہل، کوتاہ نظر، مفاد پرست اور زر پرست ہے۔ لوگوں کو یہ بھی لیکن ہو گیا ہے کہ پاکستان اور ہندوستان ہماری ریاست کو اپس میں تقسیم تو کر لیں گے لیکن اس کی وحدت کی بحالی کے حق میں نہیں بیس حالانکہ بھارت کے سابق وزیر اعظم نر سناراؤ نے پاکستان کے ہم منصب کو کہا تھا کہ اگر پاکستان جموں کشمیر چھوڑنے کے لیے تیار ہے تو بھارت بھی چھوڑ دے گا۔

مہاترے کیس میں امان اللہ خان کو جن ساتھیوں کی قربانی کے نتیجے میں پزیرائی ملی وہ انہی کے خلاف ہو گے۔ وہ اپنی کتاب جہد مسلسل کی تین جلدیوں میں بعقول ان کے ایک ہمعصر اور تحریکی ساتھی صحافی میر عبد الحزیز مرحوم، میں۔۔۔ میں کی رٹ لگاتے رہے۔ تنظیم کو پاؤں پر کھڑا کرنے والے نظریاتی ساتھیوں کو مکمل طور پر نظر انداز کر کے موقع پرست افراد کو اجاگر کرتے رہے جس سے تنظیم کے اندر ریت انشا پیدا ہوا کہ لبریشن فرنٹ محسن کش تنظیم ہے۔ نئے چہرے لبریشن فرنٹ کی شہرت سے فائدہ اٹھا کر جہاں بہتر ایڈ جسٹمنٹ ملی ادھر چلے گے۔ میر عبد الحزیز کے مطابق امان اللہ خان ہمیشہ یہ تاریخینے کی کوشش کرتے تھے کہ تحریک صرف ان کے دم خم سے زندہ ہے کیونکہ ساتھیوں کے کروار کو تسلیم کرنا ان کی سرشت میں نہیں۔ کارکنوں کی شدید خواش کے باوجود یاسین ملک کے ساتھ صلح کرنے کے بجائے انہیں بارہ سال تک را کا یجٹ قرار دے کر غدار کہتے رہے لیکن پھر کسی خفیہ قوت کی ایما پر جب راتوں رات اتحاد کیا تو سینئر ترین ساتھیوں کو خربت نہ ہوئی۔ انہوں نے یہ سوچ بھی پروان چڑھانے کی کوشش کی کہ مقبول بٹ کولیڈر انہوں نے بنایا ہے ورنہ سردار قیوم کے الفاظ میں بٹ ایک قاتل ہی تو تھا۔ میں نے اس بحث پر کہا کہ مقبول بٹ امان اللہ خان کی ضرورت تھے۔ لوگوں کی توجہ اور ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے مقبول بٹ کے نام اور قربانی کے علاوہ امان اللہ خان کے پاس کچھ نہ تھا۔ آج مقبول بٹ شہید کے بارے اس طرح کی گفتگو بدیانتی، بد اخلاقی اور احسان فراموشی ہے۔ احسان فراموش کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ تحریک کی خاطر طویل قید کاٹ کر بری ہونے والوں کو آر پار کے اقتدار پرست ٹولنے تو دو وقت کی روٹی کے لیے کچھ نہ کرنا تھا، نام نہاد آزادی پسندوں کی صفوں میں بھی کچھ ایسے لوگ ہیں جو تحریک آزادی کشمیر کے لیے عملی قربانی دینے والے جب طویل قید سے بری ہو کر آتے ہیں تو قابضین کی ایما پر سالیق قیدیوں کو ان کی قربانی کے نتیجے میں پروردش پانے والے بھی قبول نہیں کرتے کیونکہ یہاں کارکن بننے کے لیے کم اور لیڈری کی

حرص کے اسیز زیادہ ہیں۔ اگر کوئی چند لمحات ہمارے لوگوں کے ساتھ بیٹھے تو وہ آسانی سے ہماری اس نفیتی کمزوری کو بجانپ لیتا ہے۔ جب تک ہماری تحریک میں اخلاص، جانشناور باصلاحیت و جرات مند لوگوں کی قدر نہیں کی جاتی تب تک کامیابی ناممکن ہے کیونکہ قابضین موقع پرست۔ کمزور شخصیات اور خود و نمائش کے اسی افراد کو آسانی سے استعمال کر لیتے ہیں۔

جوں کشیریکی تحریک و تنظیم کے علاس آئیے افریقہ کی غیرت مند عوام کی سوچ کا جائزہ لیں۔ جنوبی افریقہ کے نیشن منڈیلا کو برطانیہ کی اس وقت کی وزیراعظم مارگریٹ تھجپرنے دہشت گرد قرار دیتے ہوئے منڈیلا کی پارٹی کے قائم مقام صدر اولیور ٹامبو کو مشورہ دیا کہ اگر منڈیلا کی جگہ کسی قابل قبول ادمی کو قیادت سونپی جائے تو برطانیہ ان کی آزادی کی حمایت کرے گا۔ عظیم اولیور ٹامبو اور ان کی افریکین نیشنل کانگرس نے برطانیہ کی تجویز کو خارت سے ٹھکراتے ہوئے کہا کہ منڈیلا ہی ان کے اصل لیڈر ہیں۔ اگر برطانیہ اپنی مرضی سے اپنی قیادت کا انتخاب کرتا ہے تو جنوبی افریقہ کو بھی یہ حق حاصل ہے۔ نیشن منڈیلا جب بڑی ہوئے تو سب سے پہلے انہوں نے آئرلینڈ اور لیبیا کا دورہ کر کے ان کی حمایت کا شکریہ ادا کیا۔ برطانوی وزیراعظم تھجپرنے سخ پا ہوتے ہوئے کہا کہ نیشن منڈیلا نے لندن سے گزر کر پہلے ہمارے مخالف آئرلینڈ جا کر اچھا نہیں کیا لیکن منڈیلا نے کہا پہلے ہم ان دوستوں کے پاس جائیں گے جنہوں نے مشکل وقت میں ہمارا ساتھ دیا۔ افریقہ کے ایک اور مشہور لیڈر ہمارے کے رابرٹ موگا بے کے خلاف بھی برطانیہ نے ہم چلانی مگرنا کامی ہوئی۔ اسی وجہ سے افریکین یونین تیسری دنیا کی مضبوط ترین یونین ہے جبکہ عرب لیگ اور آٹی سی برائے نام یونین ہیں۔ ایک اللہ اور ایک رسول کا ورد کرنے والے اپنے قول فعل میں تضادات کا شکار ہیں۔ اسرائیل اور حساس کی جگہ میں امریکی اور برطانوی حکمران اسلحہ سمیت راتوں رات اسرائیل پہنچ آئے مگر عرب حکمران ہی نہیں یا سر عرفات کے جاشین محمود عباس پر بھی ابھی تک سکتہ طاری ہے۔ بدقتی سے مسلمان ہر جگہ بد عملی، بے عملی، سیاسی تنگ نظری اور بے حصی کا شکار ہیں۔ شاید برعغیر کی مٹی میں کوئی نقص ہے کہ یہاں محشین کو جلد بھلا دیا جاتا ہے یہاں تک کہ بے ظیرو بھوایک طرف امریکہ پر ان کے والد کو پھانسی لگوانے کا الزام لگاتی رہیں اور دوسرا طرف جمل سے بڑی ہو کر ذوق فقار علی بھٹو کو پھانسی سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرنے والے کریں قذافی کا شکریہ ادا کرنے کے بجائے امریکہ چلی گئیں

کیونکہ پاکستان میں امریکہ کو ہی طاقت کا منع تصور کیا جاتا ہے۔ ہماری نوجوان نسل کو اس کا جائزہ لے کر ان کمزور بیوں کا توتھ کرنا ہوگا۔ جس طرح مضبوط عمارت کے لیے مضبوط بنیاد کی ضرورت ہوتی ہے اس طرح مضبوط تنظیم کے لیے نظریاتی، جانبدار اور پختہ سوچ کے مالک ساتھیوں پر مشتمل ٹیم بنانے کی ضرورت ہوتی ہے۔

غیر مسلم کشمیری

ایک اور بڑی حقیقت جس کو ہماری تحریک میں نظر انداز کیا گیا وہ ریاست کی تیس فی صد مضبوط غیر مسلم آبادی ہے جسکو ریاست کی وحدت کی بجائی کے لیے اعتماد میں لینا ضروری ہے۔۔۔ ریاست کی آزادی کی تحریک کو صرف مسلمانوں کی تحریک قرار دینے والے غیر محسوس طور پر بھارت کے ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں۔ بھارت غیر مسلموں کو ان کے مستقبل کے حوالے سے خوف زدہ کر کے اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کر رہا ہے۔ ہمیں ریاست کے غیر مسلموں کو بھی یقین دلانا چاہیے کہ یہ ریاست ان کی بھی اتنی ہے جتنی مسلمانوں کی تاکہ وہ تحریک میں بھر پور حصہ لیں۔ الحاق پاکستان کی تحریک اور ریاست جموں کشمیر کی وحدت کی بجائی کی تحریک سمندر کے دو کنارے پیں جو کبھی نہیں مل سکتے۔ بھارت نے نیشنل کانفرنس کے لیڈروں کو ایک دوسرے کے خلاف استعمال کر کے ریاست جموں کشمیر کو صوبائی حیثیت دی اور بالآخر ۵ اگست ۲۰۱۹ کوریاست کی خصوصی حیثیت ہی پہنچ کر دی جبکہ یہی کام پاکستان نے مسلم کانفرنس کو استعمال کر کے ۱۹۷۹ میں کر دیا تھا۔ یہ دونوں جماعتیں آج اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہی ہیں۔ تقسیم کے دو سال بعد کراچی معاہدہ کیا گیا، مگر بلقستان میں پچاس سال قبل سیٹ سنجیٹ کا خاتمہ، دو ہزار نو میں جی بی کو صوبائی حیثیت دی گئی اور آزاد کشمیر میں ایک ۷۱۹ مسلط کیا گیا جس کا مسودہ ذوالفقار علی بھٹو کے وزیر قانون حفیظ پیززادہ نے تیار کیا اور آزاد کشمیر اسمبلی نے آنکھیں بند کر کے من و عن قول کر لیا۔ اگر ایمانہ ہوتا تو بھارت کو بھی شب خون مارنے کی جرات نہ ہوتی۔ نوجوان نسل کو یہ سارے تھاکر اور ان سے پیدا ہونے والی خرابیوں کو سامنے رکھ کر مستقبل کی رائیں معین کرنا ہوں گی۔

سفراتی جدوجہد کیسے موثر ہو سکتی ہے؟

سفراتکاری کے لیے دو طرح کی پاور چاہیے : سافٹ اور ہارڈ پاور۔ سافٹ پاور سے مراد معاشرتی تعلقات ہیں جن کے لیے ادبی، سیاسی اور ذاتی نشستوں، خط و کتابت اور اس جدید دور میں سوشل میڈیا کا بھی سہارا لے کر پر امن طور پر اپنے بیانیہ کو پر و موت کیا جا سکتا ہے۔ ہارڈ پاور میں طاقتوں میں عسکری اور سیاسی طاقت کا استعمال بھی کرتی ہیں لیکن سافٹ پاور میں باو کے بجائے دوسروں کو قتال کر کے ہمنو اپنے کی کوشش کی جاتی ہے جبکہ ہارڈ پاور میں عسکری قوت اور اقتصادی پابندیوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ سافٹ پاور کے لیے ایسے باشوروں باصلاحیت افراد کی ضرورت ہوتی ہے جو عالمی سوچ و فکر، تاریخ اور سفارتی ادب سے واقف ہوں اور اپنی ثقافت و بیانیہ کو پر و موت کرنے کی صلاحیت رکھنے کے ساتھ ساتھ دوسروں کے رسم و رواج اور ترجمیات کو بھی سمجھتے ہوں۔ آزاد قومیں اپنے مفادات کے لیے دو نوں سافٹ اور ہارڈ پاور کا استعمال کرتی ہیں لیکن جن کو بھی آزادی حاصل کرنی ہے ان کی پہلی ترجیح تو سافٹ پاور ہوتی ہے لیکن دنیا کی بے حد انبیاء مسلح جد و جہد پر بھی مجبور کر دیتی ہے جس کی یورپ میں آر لینڈ کی تحریک بھی ایک مثال ہے۔ الیگریا کی نیشنل لبریشن فرنٹ کی سافٹ ڈپلومیسی اتنی موثر تھی کہ جب اس کی تعلیم یافتہ ٹیم یورپ بھر میں پھیل گئی تو مغربی میڈیا نے نیشنل لبریشن فرنٹ کو ڈپلو میک فرنٹ کا نام دے دیا۔ جنوبی افریقہ میں سفید فام کی مضبوط حکومت کے باوجود یورپ میں نیلسن منڈیا کی افریکن نیشنل کانگرس کے متوازی سفارتی یوروں قائم تھے۔ اسی طرح یا سر عرفات کی پی ایل او کے بھی پہلے مصیرین اور بعد میں سفارت خانے قائم ہوئے۔ اس کے برعکس آزاد جمیون کشمیر کے نام سے ایک مکمل ریاستی ڈھانچہ موجود ہونے کے باوجود کسی بھی ملک کے ساتھ ہمارے سفارتی تعلقات نہیں ہیں اور نہ کوشش کی گئی۔ مسلم کانفرنس نے پاکستان کو اپنا سفیر اور وکیل بنایا جسے دنیا جمیون کشمیر پر پہلا حملہ آور قرار دیتا ہے۔ اقوام متحده کی قرارداد کے مطابق رائے شماری کے وقت پاکستان اپنی پوری اور ہندوستان کے چھ فوج نکالے گا اور کچھ فوج رائے شماری تک امن و امان کے لیے رکھے گا۔ پاکستان نے ۱۹۷۴ء میں آزاد کشمیر کی فوج ختم کر کے مسئلہ کشمیر کو زبردست نقصان پہنچایا ہے۔ رائے شماری کے وقت یہ مطالبہ کیا جا سکتا تھا کہ امن و امان

قائم رکھنے کے لیے بھارت کی کچھ فوج کے بجائے آزاد کشمیر کی اپنی فوج امن و امان کے لیے کافی ہے لیکن برطانیہ شروع سے ہی آزاد کشمیر فوج کے خاتمے کا مطالبہ کر رہا تھا جس کا مقصد بھارت کے ہاتھ مضبوط کرنا تھا اور بالآخر ہزار سال تک کشمیر کی جنگ لڑنے کا اعلان کرنے والے بھٹونے آزاد کشمیر فوج کو پاکستان فوج میں ختم کر دیا۔ اب ہندوستان اور پاکستان کی ہٹ دھرمی اور اقوام متحده کی عملی کی وجہ سے جو صورت حال پیدا ہوئی ہے اس کے نتیجے میں ہمیں بھی حق پہنچتا ہے کہ ہم رائے شماری کا اپشن مکمل طور پر رد کر کے تمام افواج کے انخلاء کا مطالبہ کریں۔ اگر قابضین اپنا تسلط قائم رکھنے کے لیے ہارڈ پاور کا استعمال کر سکتے ہیں تو ہمیں بھی عسکری جدوجہد کا حق ہے۔

ستره میں دو ہزار پانچ کو بربی ہونے کے بعد میں جموں کشمیر کی آزادی پسند تنظیموں کی سفارتی حکمت عملی کا جائزہ لیتا رہا۔ واضح ہوا کہ ہر تنظیم کے اندر ایک برائے نام سفارتی شعبہ تو قائم ہے لیکن عملی طور پر کوئی کام نہیں ہو رہا۔ برطانیہ میں سفارتی شعبہ کے سر برہ پروفیسر راجہ ظفر خان ایک باصلاحیت ادمی ہیں لیکن ان کو مطلوبہ پسیں اور سپورٹ نہیں دی گئی یا کوئی اور وجہ تھی، ان کی سفارتی جدو جہد بھی محدود سطح تک رہی۔ زندگی کے آخری سالوں میں امام اللہ خان نے کئی بار مجھ سے سفیروں اور عاملی اداروں و شخصیات کے نام خطوط ڈرافٹ اور کپیوز کروائے لیکن اس کام کے لیے انہوں نے کسی کو کبھی مستقل ذمہ داری نہ سونپی جس کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ ہر شبی کے اختیارات اپنے پاس رکھنے کے عادی تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ وہ دفتر میں آ کر چائے پی کر چلے جانے والے ساتھیوں سے یہ کام کیوں نہیں کرواتے تو کہنے لگے یار یہ سب ایسے ہی ہیں۔ میں نے کہا امان صاحب یہی بات آپ نے مجھے تیس سال پہلے بھی کئی تھی جب میں پہلی بار برطانیہ گیا تھا اور آپ نے مجھ سے کچھ خطوط ناپ کروائے تھے۔ اب تک تو تبدیلی آ جانی چاہیے تھی۔ انہوں نے کوئی خاص جواب نہ دیا۔

میں نے اپنے طور پر ۲۰۰۹ سے کچھ سفارتکاروں کے ساتھ ملاقاتیں شروع کر رکھی تھیں۔ سب سے پہلے لیبیا کے سفیر سے ملا۔ کریم قدانی نے اسی سال اقوام متحده کی جزوی اسیبلی میں خطاب کرتے ہوئے ہندوستان اور پاکستان پر زور دیا تھا کہ وہ اپنی افواج نکال کر جموں کشمیر کو متحد کر دیں۔ گوکریم قدانی کا شروع سے ہی یہ موقف رہا لیکن لیبیائی سفیر کے ساتھ میری درجنوں ملاقاتوں کا بھی عمل دل تھا۔ لیبیائی سفیر کی ہماری توقع سے بھی زیادہ ہماری سیاست پر نظر تھی۔ اس کا اندازہ مجھے

اس وقت ہوا جب انہوں نے کہا کہ کراچی سے ایم کیوائیم نے بھی آ کرائے کے اور جی بھی میں سیٹین لے لی ہیں اور بھارتی مقبوضہ کشمیر میں غیر ریاستی سیاست مضبوط ہو رہی ہے۔ ان حالات میں جموں کشمیر کو کیسے آزادی مل سکے گی۔ فلسطین سفیر نے بھی کافی خدشات اظہار کیا۔ دو ہزار دس میں شام کے سفیر کے ساتھ میری ملاقات ہوئی جس نے کہا کہ لبنان کے سفیر عرب لیگ کے نمائندہ ہیں جنہیں میں خط لکھوں تاکہ تمام عرب سفیروں کے ساتھ ایک مشترکہ ملاقات ہو سکے مگر پھر عرب سپرنگ کی ہوا چل پڑی اور دن بدن عرب دنیا میں حالات خراب ہوتے گے۔ ترک اور ایرانی سفیروں کے ساتھ کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ ترکی کشمیر کو پاکستان کی نظر سے دیکھتا ہے کیونکہ پاکستان کے ساتھ ترکی کے معاشری مفادات جڑے ہوئے ہیں۔ ترکوں نے جب مجھے اسلامی اتحاد کا لیکھر دینا شروع کیا تو میں نے کہایا کام آپ کر سکتے ہیں جو آزاد ہیں۔ آپ قدم اٹھائیں ہم ساتھ ہیں لیکن آپ سارے مسلمان پڑوی آپس میں اڑ رہے ہیں۔ ایران کی اپنی کشمیر پالیسی ہے لیکن ہماری آزادانہ سفارتکاری کے فقادان کی وجہ سے کوئی بڑی پیش رفت نہ ہو سکی۔ دو ہزار سترہ تک میں آزاد کشمیر سے بھی برطانوی وزارت خارجہ کے ساتھ رابطے میں رہا لیکن برطانیہ نے بصریہ سے نکلنے وقت جو کشمیر پالیسی طے کی تھی اس سے وہ بارہ نہیں نکلتا چاہتا اور وہ پالیسی یہ تھی کہ جموں کشمیر ہندوستان اور پاکستان کا دو طرفہ مسئلہ ہے جس میں وہ جموں کشمیر عوام کو کوئی ابھیت نہیں دیتا۔ امریکہ کے سفارتکاروں کے ساتھ بھی میری متعدد ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ سن پچاس کی دہائی تک امریکہ کی کشمیر پالیسی کس حد تک بہتر تھی لیکن اب وہ بھی بدلتا چکا ہے۔ پھر بھی وہ خطے پر نظر رکھنے کے لیے سفارتی ملاقاتوں کو ابھیت دیتا ہے۔ روئے اور میلیشیا کے سفارتکاروں سے بھی میری ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ان کی فی الحال جموں کشمیر بارے کوئی حتمی رائے نہیں ہے۔

مسئلہ جموں کشمیر کا حل؟

کسی بھی مسئلہ کے حل سے پہلے اس کے پیدا ہونے کی وجوہات دیکھنا اور سمجھنا ضروری ہے۔ جموں کشمیر کی نوجوان نسل کو من پسند تاریخ پڑھانے کے لیے دونوں ہندوستان اور پاکستان نے مطالعہ جموں کشمیر کو نصابی کتب سے نکال دیا تھا۔ جب تیقیم سے لے کر آج تک ہندوستان اور

پاکستان کے حواری اقتدار پرست ریاستی ٹولے نے بھی اپنی عوام کو اصل حقائق بتانے کے بجائے وہ کچھ بتایا جو دلی اور اسلام آباد میں بیٹھے ان کے آ قاسنا پسند کرتے تھے بلکہ انہوں نے ایسی غیر نصابی کتب پر بھی پابندی عائد کر دی جن میں نوجوان نسل کو اصل تاریخ بتانے کی کوشش کی گئی۔ میری یہ کتاب چونکہ مقبول بٹ کی شہادت اور مہاترے کیس پر لکھی گئی ہے اس لیے میں جموں کشمیر کی تاریخ کی تفصیل میں نہ جاتے ہوئے اس کی جانکاری میں دلچسپی رکھنے والوں کے لیے جاوید عنایت کی کتاب جموں کشمیر کی تاریخ:، مسئلہ اور حل کے مطالعہ کی تجویز دونگا لیکن اختصار سے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ہندوستان کی تقسیم کا جموں کشمیر کی تحریک سے کوئی تعلق نہ تھا اور نہ ہے۔ جموں کشمیر میں صرف حقوق کی تحریک تھی جبکہ ہندوستان میں آزادی کی تحریک تھی۔ ہندوستان پر غیر ملکی قبضہ تھا جبکہ جموں کشمیر پر اسی ریاست کا حکمران تھا جس سے عوام سیاسی و جمہوری حقوق مانگ رہی تھی۔ انگریز ہندوستان کی طرح جموں کشمیر کو بھی تقسیم کرنا چاہتا تھا جس کی وجہ سے اس نے مہاراجہ کی حکومت سے جمہوری حقوق کی تحریک کو بغافت میں تبدیل کرو کر ریاست کو تقسیم کر دیا اور ہمارے پچھناداں دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے باپ دادا نے چھریوں اور کھڑیوں سے ریاست کا چار ہزار مرلیخ میل علاقہ آزاد کرایا۔ ہم آزاد نہیں تقسیم ہوئے ہیں۔ چار اکتوبر سن سینٹا لیس کو پلندری میں قائم ہونے والی حکومت کا اعلامیہ پاکستانی حکمرانوں کو ناگوار گزرا تو انہوں نے چوبیں اکتوبر کو آزاد کشمیر حکومت کی اس روشنکیل کر کے اس کا ہیڈ کورٹ مظفر آباد منتقل کیا اور انو رکار کی جگہ سردار براہیم کو صدر بنادیا۔ ریاست کی تقسیم میں آله کاری کا کردار ادا کرنے والی مسلم کافرن مسلم لیگ میں شامل ہو کر بالآخر اپنے انجام کو پہنچ گئی۔ دوسرا طرف بھارتی مقبوضہ کشمیر میں انڈین کانگرس کی آ ل کارپیشن کافرن بھی ہچکو لے کھا رہی ہے جس نے جموں کشمیر کو ریاست سے صوبہ بنانے میں گھناؤ نا کردار ادا کیا۔ الغرض کی جس کسی نے اپنی ریاست اور قوم کے ساتھ خداری کی اس کا انجام برآ ہوا۔

انگریز جموں کشمیر میں ہندوستان کے داخلے کی راہ ہموار کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے پاکستان کو بیوقوف بنایا کر پہلے حملہ کروانے کی سازش کی جو ۱۴۲ اکتوبر سن سینٹا لیس کو ہوا جس کے بعد میں پلان کے تحت بھارت نے مہاراجہ سے فوجی امداد کی درخواست کروائی تاکہ بھارت کو جموں کشمیر میں فوج کشی کا قانونی جواہر مل سکے۔ مہاراجہ ہری سنگھ سے بھارت کے پہلے گورنر جنرل لا رڈ مونٹ بیٹھنے کے نام خط لکھوا یا گیا جس کے نتیجے میں پاکستانی قلبکیوں کے حملے کے پانچ دن بعد یعنی سنہ تائیں

اکتوبر سنہ تیس کو بھارتی فوج سر بیگنگ ہوائی اڈے پر اتری۔ پاکستان کی طرف سے پہلے حملہ کرنے کی وجہ سے ہی اقوام متحده نے اپنی قرارداد نمبر سینٹا لیس میں رائے شماری کے لیے پاکستان کو پوری اور ہندوستان کو کچھ فوج نکال کر باقی فوج رائے شماری تک امن و امان کے لیے رکھنے کی ہدایت کی۔ ہندوستان اور پاکستان نے اس قرارداد پر اعتراضات کیے اور یوائیں کمیشن نے کم جنوری سن انجاس کو فائزہ بندی تو کروائی لیکن سال کے آخری ماہ دسمبر میں اپنے مشن کی ناکامی کا اعلان کر دیا۔ بھارت اور پاکستان نے عالمی برادری اور جمیل کشمیر کی عوام سے کیے گئے وعدے پورے کرنے کے بجائے اپنے قبضے کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے کے لیے ہرنا جائز اور غیر انسانی حرہ استعمال کیا۔ بھارت تواب سرے سے مانتا ہی نہیں کہ جموں کشمیر کوئی مسئلہ ہے۔ اس کے نزدیک اگر کچھ باقی ہے تو وہ صرف پاکستان والے کشمیر کی آزادی ہے جبکہ پاکستان اور مفاد پرست کشمیری ٹولہ کے نزدیک حق خود ارادیت کا مطلب الحاق پاکستان ہے جس کے امکانات دن بدن معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔ جہاں تک ریاست جموں کشمیر کی وحدت کی حمایت کرنے والے گروپوں کی قیادت کی بات ہے تو وہ ایک لاکھ سے زائد شہیدوں اور ہزاروں غازیوں کی قربانیوں کو داؤ پر لگانے کے سگین جرم کی مرتكب ٹھہرائی جا رہی ہے۔ جس کسی نے جس بھی تنظیم کے پلیٹ فارم سے قربانی دی ہے وہ قابل احترام ہیں۔ ایک عملی حریت پسند کی حیثیت سے میں جانتا ہوں کہ قربانی دینے والا کسی غلط فہمی یا غلط پالیسی کا شکار تو ہو سکتا ہے لیکن اس کے اخلاص پر کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ دنیا کا کوئی انسان خلوص کے بغیر جان کی قربانی نہیں دے سکتا۔ جدوجہد کے لیے خلوص جرتو ہے کل نہیں ہے۔ قیادت کے لیے محض خلوص ہونا کافی نہیں بلکہ جرات مند، باشour، پر عزم، تربیت یافتہ اور مضبوط اعصاب کا مالک ہونا ضروری ہے جو کسی بھی مقام پر مصلحت اور بزرگی کا شکار نہ ہو۔

بر صغیر کے کچھ مسائل باقی دنیا سے بہت مختلف ہیں۔ بر صغیر کا خطہ شخصیت پرستی اور توہم پرستی کا شکار ہے جہاں تحقیق و تخلیق پر کم اور تقلید پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ اسی لیے یہاں موروثیت زیادہ مضبوط ہے۔ کچھ لوگوں کا تو یہ بھی یقین ہے کہ انہیں خود قرآن پاک بھی پڑھنے اور سمجھنے کی ضرورت نہیں۔ وہ دوسروں سے پڑھوا کر سخنواریں لیں گے۔ اسی لیے درباری سیاست یہاں کی سب سے بڑی منڈی ہے۔ تحریک آزادی میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو پیغمبر پرستی، قبیلہ پرستی اور برادری ازم کرتے ہیں۔ معاشرے کے استحکام کا دار و مدار ہنر منڈی اور خود انحصاری پر ہے۔ اسی لیے ان

خلدون نے گیاراں صدیاں پہلے کہا تھا کہ کسی ایک نسل یا گروکا دو سے زائد بار اقتدار میں رہنا غلط ہے۔ ایک تو وہ اقتدار کو اپنا حق سمجھ کر اس پر قابض رہنے کی کوشش میں ظالم بن جائیں گے دوسرا نا اہل اور سہل پسند تقلیدی پیر و کاروں کو پیدا کرنے کا موجب بنتے ہیں جو انہیں چیخ نہ کریں۔ قومی آزادی کے لیے منظم تحریک کی ضرورت ہے۔ تحریک کے لیے مضبوط تنظیم اور مضبوط تنظیم باصلاحیت، مخصوص اور ایسے جرائم کا رکنوں سے بنتی ہے جو کبھی بھی اپنے ساتھیوں اور تحریک سے بے وفائی نہ کریں۔ سیاسی شوق و جذبہ جہاں لوگوں کو متحرك رکھتا ہے وہاں سیاسی حرمس خطرناک بھی ہوتی ہے کیونکہ سیاسی حریص نمود و نمائش کا اسیر اور غیر روادار ہوتا ہے۔ خود نمائی کے اسیر لوگ باصلاحیت دوستوں کو قوت کے بجائے خطرہ تصور کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے آزادی کی تنظیمیں دھڑے بندیوں اور مذہبی جماعتیں فرقہ پرستی کا شکار ہیں۔ ایسے لوگ معمولی پیشکشوں پر بھی بک جاتے ہیں۔ فرقہ پرست جماعتوں کا تو یہ حال ہے کہ وہ سیکولر جماعتوں کے ساتھ شاید اتحاد کر لیں لیکن کسی مذہبی جماعت کے ساتھ اتحاد کم ہی کریں گی۔ تحریک کی کامیابی عد کے بجائے معیار اور صلاحیتوں کی محتاج ہوتی ہے۔ نالائق اور نا اہل لوگوں کی تعداد بڑھانے کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ ایسے لوگ بے شک مخصوص ہوں وہ سیاسی دباؤ برداشت نہیں کر سکتے اور الٹا تحریک و تنظیم کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ رکنیت کا معیار رکھا جائے۔ جو اس پر پورا نہ اترے اسے رکنیت نہ دی جائے۔ رکنیت سے پہلے لوگوں کو ازما یا جائے۔ تحریکی لوگوں کو زیادہ دوست بنانے سے گریز کرنا چاہیے بلکہ زیادہ دوست کسی کے لیے بھی اچھے نہیں کیونکہ جب آپ اپنی محنت اور صلاحیت کے بل بوتے پر کسی سے سبقت لے جائیں گے تو مبارک دینے والے کم اور حسد کرنے والے زیادہ ہو گے۔ انفلیشن دنیا کی ہر تحریک میں ہوتی ہے لیکن مضبوط تنظیم مضبوط دیوار کی طرح ہوتی ہے جس کے اندر رخنہ ڈالنا مشکل ہوتا ہے۔ ہماری تحریک میں بھی آج تک جتنے اختلافات پیدا ہوئے اس کے پیچھے موقع پرست سیاسی لوگ تھنہ کہ وہ جنہوں نے اپنے خون سے تنظیم و تحریک کی آبیاری کی۔ ہماری تحریک میں انفلیشن اس لیے آسان رہی کہ یہاں موقع پرستوں کو رکنیت سے پہلے عہدے دے دیے جاتے ہیں

بر صغیر دنیا کا ایک اہم باسائل اور رخیز خط ہے لیکن سامراجی قوتوں نے اسے علاقائی مسائل اور جھگڑوں میں الجھا کر غیر موثر کر کھا ہے۔ بر صغیر کی عوام اور خاص کر دانشور برادری کو مل جل کر بر صغیر کے سیاسید انوں کو رائے راست پر لانا چاہیے یا ان کی جگہ فہم و فراست اور اتحاد و اتفاق پر

لیقین رکھنے والی ایک ایسی تبادل قیادت سامنے لائے جو اپنے مسائل کو طول دے کر بروئی مداخلت کو
 دعوت دینے کے بجائے اپنے مسائل گفت و شنید کے ذریعے حل کرے۔ یہ تب ہو گا جب خطے کے
 چھوٹے ممالک پر طاقت کے بل بوتے پر اپنی مرضی مسلط نہیں کی جائے گی بلکہ ان کے شخص کو متاثر
 کیے بغیر ان کو ساتھ لے کر چلنے کی کوشش کی جائے گی۔ یورپی یونین میں لگو مبرگ جیسا ایک ملین آبادی
 والا ملک بھی ہے جس کی اتنی ہی اہمیت ہے حتیٰ برطانیہ فرانس اور جرمی جیسے بڑے طاقتو رہنماء کی۔
 بر صیر کو یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ کس طرح انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی نے بھارتی لوگوں پر مشتمل
 فوج بنانے کے باوجود ایک ملین غیر منظم ہندوستانیوں کو اپنا غلام بنائے رکھا۔
 تقسیم کے وقت انگریزوں کی ہندوستان میں کل آبادی ایک لاکھ پچیس ہزار تھی جس میں سے اتنا لیس
 ہزار کے قریب سو ملین تھے۔ پہلی جنگ عظیم میں برٹش انڈین اری کی 1.5 ملین نفری نے بیرون
 ملک یورپ کی خاطر جنگ میں حصہ لیا جس میں سے پچھتر ہزار مارے گئے اور ست اسٹھ ہزار زخمی
 ہوئے۔ برٹش انڈین اری کے افسران انگریز خود تھے جبکہ فوجی انڈین تھے۔ مغربی اتحادیوں کی یہ
 اصل جگہ اس طاقت کے خلاف تھی ہے ہمارے نامنہاد مسلمان حکمران خلافت یا سلطنت عثمانیہ کہتے
 ہیں۔ اگر یہ ان کی خلافت تھی تو بر صیر کے علماء نے کیوں اپنے لوگوں کو اپنی خلافت کے خلاف
 انگریزوں کی جنگ میں جھوٹا؟ دوسرا جنگ عظیم میں اٹھائی ملین بھارتی فوج نے انگریزوں کی
 خاطر دوسرے برابر اعظموں میں جنگ لڑی۔ ان فوجیوں کی اکثریت مسلمانوں کی تھی جو جن کو کافر کہتے
 ہیں انہی کی خاطر پہلی اور دوسرا جنگ میں اپنی قربانیوں کو شہادت کا نام دیتے ہیں مگر انگریزوں کی
 جنگ سے واپس آئے تو اپنے جس مذہب کو رد کر کے انگریزوں کی خاطر سلطنت عثمانیہ کے خلاف
 لڑے اسی مذہب کے نام پر اپنے پانچ ملین عوام کو ذبح کر دیا۔ انگریزوں نے عربوں کو بھی ترکوں کی
 جگہ ان کو مسلمانوں کی قیادت دلانے کے لائق میں سلطنت عثمانیہ کے خلاف جنگ میں اپنے ساتھ
 شامل کر لیا تھا لیکن جنگ جیتنے کے بعد عرب دنیا کو ۲۲ ممالک میں تقسیم کر کے ان کے دل فلسطین میں
 اسرائیلی ریاست قائم کر دی جس نے آج سب عربوں کو نکیل ڈالی ہوئی ہے۔ اس حوالے کا واحد مقصد
 یہ ہے کہ قوموں کو کامیابی کے لیے وسیع علاقے، بڑی فوج اور وسائل سے زیادہ سیاسی بصیرت اور نظم و
 ضبط کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ چالیس ہزار انگریزوں اس وقت کے سات سو ملین بھارتیوں پر راج نے
 قائم رکھ پاتے۔ دنیا کی آٹھ ملین آبادی میں سے صرف ۰۲۰ فی صد یہودی ہیں جن کی کل آبادی

15.7 ملین بنتی ہے اس نے دنیا کو نیل ڈال رکھی ہے۔ اب اسی طاقتور یہودی ریاست اور اس کی پشتیبان دنیا کی سپر پا اور امریکہ اور برطانیہ کو بیش ہزار منظم جماس کے جنگوں نے اپنی منظم پالیسی سے صرف عسکری طور پر ہی گھٹنے لئنے پر مجبور نہیں کیا بلکہ امریکہ، برطانیہ اور اسرائیل کی اپنی عوام بھی ان کے غیر انسانی مظالم کے خلاف میدان میں آگئی ہے۔ اسی طرح میں ملین ریاست جموں کشمیر عوام بھی اگر متعدد منظم ہو جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ دنیا ان کا ساتھ نہ دے۔ کچھ حکمران تو ظالم ہو سکتے ہیں لیکن انسانیت اب بھی زندہ ہے۔

محازرائے شماری کی رپورٹ:

محازرائے شماری کی قیادت نے ایک دعویٰ اور ایک الزام تو اتر سے دہرا یا۔ دعویٰ یہ تھا کہ محازرے نے انکوائری رپورٹ میں ثابت کیا ہے کہ جو مہاترے کے قاتل ہیں وہی مقبول بٹ کے قاتل ہیں۔ یہ رپورٹ مجھے جناب عبدالحلاق انصاری صاحب اور جبار بٹ صاحب نے سرسری طور پر دکھائی۔ میں نے پوچھا مہاترے کا قاتل کون ہے؟ دونوں بزرگ فرمانے لگے امام اللہ۔ میں نے کہا آپ نے امام اللہ کا نام تو لکھا ہی نہیں۔ جب کوئی پڑے گا کہ مہاترے کے قاتل ہی مقبول بٹ کے قاتل ہیں تو پڑھنے والے کو کیسے معلوم ہو گا کہ آپ کے ذہن میں امام اللہ ہے۔ وہ تو سوچیں گے کہ آپ ان لوگوں کو لازام دے رہے ہیں جنہوں نے اس ناکرده جرم میں سزا کائی ہے۔ انصاری صاحب نے اتفاق کیا کہ نام واضح کرنا چاہیے تھا۔ دوسرا لازام یہ تھا کہ امام اللہ خان نے ہم نوجوانوں کو استعمال کیا ہے۔ میں نے کہا جناب استعمال ہم نہیں آپ ہوئے ہیں۔ محازرائے شماری ایک طرف کہتی ہے کہ امام اللہ 1971 میں گلگا کیس میں پنجاب پولیس سے مل گیا تھا۔ دوسری طرف محازرائے شماری نے انہیں 1976 میں برطانیہ لے جا کر دفتر قائم کر کے دیا اور ساتھ جموں کشمیر بریشن فرنٹ کا قیام عمل میں لا کر ان کو مختار کل بنادیا۔ ہم تو اس امام اللہ خان کو جانتے ہیں جس کو آپ نے اس مقام تک پہنچایا۔ لہذا استعمال ہم نہیں آپ ہوئے ہیں۔

حرف آخر

میں نے اپنے جو بھی تجربات و مشاہدات بیان کیے ہیں ان کی حمایت میں اپنی لیگل فائل سے متعلقہ عدالتی و حکومتی دستاویزات کتاب کے آخر میں شامل کی ہیں۔ جدو جہد میں شامل ہر حریت پسند کے اپنے تجربات ہیں۔ ہمیں ان تلخ تجربات کی روشنی میں اپنے آپ سے پوچھنا چاہیے کہ لا زوال قربانیوں کے باوجود پیش رفت کیوں نہیں کر پائے؟ اس کا کون ذمہ دار ہے؟ کیا ہماری ائمہ نسلیں بھی کوئی نتیجہ حاصل کیے بغیر قربانیاں دیتی رہیں گی؟ نوجوان نسل کو میراث شورہ ہے کہ تحریکی تاریخ کا جائزہ لے اور اپنی سیاسی بنیادوں کو مضبوط اور آزاد تو قمی بینائی کو جاگر کرے۔ سیاسی بنیادیں تب مضبوط ہوں گی جب تنظیم مضبوط ہوگی اور تنظیم تب مضبوط ہوگی جب رکنیت، تربیت اور احتسابی نظام ٹھیک ہوگا۔ جہاں احتسابی عمل نہیں ہو گا وہاں تنظیم بار بار ٹوٹی رہے گی۔ آج تک جس کسی نے احتساب کا مطالبہ کیا اسے تنظیم مخالف سرگرمیوں میں ملوث قرار دے کر تنظیم و تحریک کے اصل دشمنوں کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ جب ہمارا سیاسی بیس مضبوط ہو گا تو پھر سفارتی سطح پر بھی ہماری شفواٹی ہو سکے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ عسکری تربیت اور مالی و سائل پر توجہ بھی ضروری ہے۔ سیاسی سرگرمیاں یا جلسے جلوس جدو جہد کا جز ہیں کل نہیں۔ تحریک کی کامیابی کے لیے تمام شعبوں یعنی سیاسی، سفارتی، مذاہمتی ادب اور عسکریت کو مضبوط، ہم آہنگ اور متحرک کرنے کے لیے ہر شعبے کو مطلوبہ فنڈ زمہیا کرنے کی ضرورت ہے۔ سارے مالی و سائل سڑپریٹ پالیٹکس پر جھونک دینا داشتمانی نہیں ہے۔ جموں کشمیر کا بھارتی یکطرفہ حل اور پاکستان کا دو طرفہ حل بھی ناقابل عمل ہے۔ قابل عمل حل سفریقی حل ہے جس میں مناثرہ ریاست فریق اول ہے۔ فریق اول مالک اور دوسرا دونوں قابض ہیں۔ مالک اور

قابل کسی بھی دنیا کی عدالت میں سٹیشن بر اینیس ہو سکتا لیکن جموں کشمیر اس وقت تک مالک کی حیثیت سے دنیا میں نہیں دیکھا جاسکتا جب تک اس کے پاس متفقہ قومی بیانیہ اور قیادت نہیں۔ اس وقت تک ہم متفقہ بیانیہ اور قیادت سے محروم ہیں۔ اس محرومیت کی وجہات کا ذکر بھی ہو چکا ہے۔ اب نوجوان نسل کو چاہیے کہ وہ نمود نمائش کی اسیر قیادت سے نجات حاصل کر کے نوجوان قیادت سامنے لائے۔ اگر نوجوان نسل ایسا کرنے میں کامیاب ہو گئی تو اپنی منزل ضرور حاصل کر لے گی کیونکہ اپنی ریاست پر حق ملکیت کا دعویٰ قوموں کا فطری حق ہوتا ہے جو ہر باشour، باغیرت اور پر عزم قوم بال آخر حاصل کر کے ہی رہتی ہے۔ ایک حریت پند کو سیاسی، سفارتی، عسکری وادی خوبیوں کا مجموعہ ہونا چاہیے۔

000

دستاویزات

یوں تو میرے پاس ہزاروں صفحات پر مشتمل قانونی دستاویزات ہیں لیکن اس کتاب کے آخر میں نج کی بجمنٹ اور دیگر ماہرین کی روپرٹوں کی وہ چند دستاویزات شامل کی ہیں جو اس کتاب کے مندرجات سے متعلق ہیں۔ مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ میں نے جو کچھ لکھا وہ میری ذہنی اختراع نہیں بلکہ حقائق ہیں جن کے ثبوت موجود ہیں۔

۰۰۰



بجول کشمیر لبریشن فرنٹ کے چیئر مین یا سین ملک اور فرنٹ کے رہنماء عظمت اے خان قیوم راجہ کے ساتھ گارڈری جیل لیسٹر میں دورانِ ملاقات



دورانِ قید جبل قیوم راجہ کو گورنر کی طرف سے ڈپریشن کے شکار قیدیوں کی کونسلنگ کا اجازت نامہ قیوم راجہ کو دیتے ہوئے۔



آبائی شہر کھوئی رطہ میں قیوم راجہ کے استقبال کی تیاریاں (مئی ۲۰۰۵ء)



قیوم راجہ کی والدہ نصیرہ بیگم کا برطانیہ ائیر پورٹ پر استقبال ۲۰۰۱ء



قیوم رجہ کا لاہور بارے خطاب (۲۰۰۹ء)



رہائی کے موقع دوران خطاب (۲۰۰۵ء)



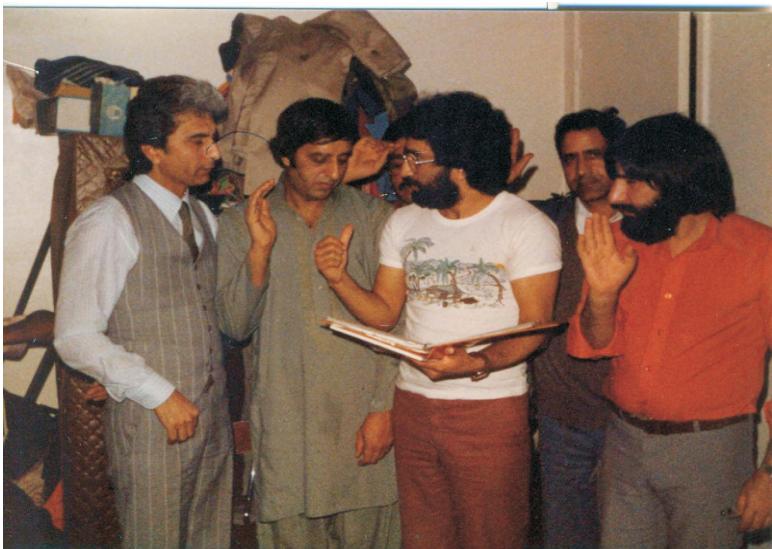
وقت رہائی ۲۰۰۵ء



قیوم راجہ۔ ۱۸ اگسٹ ۲۰۰۵ء کو براٹانوی جیل سے کھوئی رہا پنے گھر پہنچنے کے موقع پر



وزیر حکومت آزاد کشمیر مسعود خالد ڈیال، ایک ولیمہ پر قیوم راجہ سے مصافحہ کرتے ہوئے (۲۰۱۹ء)



قیوم راجہ اگست ۱۹۸۲ء میں پیرس میں لبریشن فرنٹ فرانس کے عہدیداروں سے حلف لے رہے ہیں۔



قیوم راجہ کا گھر پکنچے پر استقبال (۲۰۰۵ء، ۱۹/۰۵/۲۰۰۵)



قیوم راجہ فلسطینی سفیر کے ساتھ (۲۰۱۳ء)



قیوم راہہ همراہ سمبلی گلگت ملتستان محمد نواز خان ناجی پرنسپل ڈگری کالج کھوئی رٹ، جاوید قمر اور سٹاف



وقت گرفتاری ۱۹۸۷ء

10
DR. BRIAN IDDON

Member of Parliament for Bolton South East

www.brianiddonmp.org.uk e-mail : iddonb@parliament.uk

House of Commons

Westminster
London, SW1A 0AA
Tel : 020 7219 2096
Fax : 020 7219 2653



Constituency Office

60 St. George's Road
Bolton, BL1 2DD
Tel : 01204 371202
Fax : 01204 371374

Our Ref : BI/Raja

4 July 2005

Mr Quayyum Raja
c/o Raja Tufail Khan
Batta House
Khuiraita Bazaar
P.O. Khuiraita
DISTRICT KOTLI
A.K. Pakistan

Dear Quayyum

Thank you for your letter which I received last week at my Bolton Office and welcome back to Kashmir. I had had a report about your amazing arrival home. Apparently there was an interview with you on Zee TV during which you were kind enough to mention my name. I expect you will have enough information by now to write a book on Kashmir and your experiences. I was pleased to hear that the 'authorities' treated you decently during your 'deportation'. It isn't always the case.

Anyhow, I wish you well in whatever you now decide to do and I am sure that you will get acclimatised before too long and used to the sun and hot weather at home.

Certainly, if and when I come out again to Kashmir, I will let you know somehow. A trip was planned just before the election was called and it is the intention to reinvigorate that visit, probably now in the early Autumn. There is a meeting soon of the All-Party Parliamentary Kashmir Group, when I am sure this issue will be discussed.

Yours sincerely,

A handwritten signature in black ink, appearing to read "Dr. Brian Iddon". Above the signature, the words "Yours sincerely" are written in a printed font.

Dr. Brian Iddon
Member of Parliament for Bolton South East

Please reply to -
 Westminster Office Constituency Office

Page 1 of 2



The following documents were disclosed as a result of my petition to the High Court against secret decision, where the trial judge gave his opinion.

(TRIAL JUDGE'S SUMMING UP PAGE 4)
ANTECEDENTS:

Raja is 28, single and lived in Frandde was unemployed at the time of the offence and had no previous convictions.

A medical report which contains background information stated he was not mentally ill.

Bhatti is 44. His wife and two children live in Kashmir. He was employed as a machine operator and was of previous good character. He first came to the UK in 1963.

MITIGATION:

For Raja, it was submitted the affair blew up suddenly, Raja having come to England for a lawful purpose. He was brought in at a late stage. The cause of his people was uppermost in his mind. There was no difference between him and Riaz (2D4D).

For Bhatti, the court was invited to give credit for his change of plea and the admission he made from the outset. It was not accepted that he was an "architect and initiator". He was pressed to join the KLA by one Aslam Mirza who together with one Iqbal were the "leading supporters." The applicant went along with their planning. When disposing of evidence, his main purpose was to protect himself and not others.

(Bhatti admits he, together with Mohamed Aslam Mirza and Mohamea Mussrat Iqbal decided to kidnap a diplomat , page 40, para 141).

REPORT BY SENIOR PSYCHOLOGIST MR. LORD: EXTREME POLITICAL VIEWS:

Mr. Raja provides a clear account of his political views in relation to Kashmir situation. He states he is deeply affected by the plight of the Kashmiri people and their struggle for independence. Mr. Raja demonstrates an in depth awareness of the historical and cultural issues that have shaped such views prior to independence including witnessing the impact of the difficulties in Kashmir on members of his community and family and growing up in the country. From our discussion regarding the JKLF, he says he agrees, as he did in the past, with the aims and objectives of this group, namely gain independence for the Kashmiri people. Mr. Raja reports feeling strongly that such views are not extreme. "I've never had an extreme view....I don't think I had extreme views...I always try to have the middle ground."

SOCIAL ENQUIRY REPORT ON QAYYUM R AJA

Page 2

Mr. Raja tells me that whilst in France he became interested in the aims and objectives JammuKashmir Liberation Front to such an extent that he formed a French Branch. He tells me that the prime purpose of Jammu Kashmir Liberation front was to restore independence to Kashmir.

Prior to his arrest Mr. Raja was intending to remain resident in France for the foreseeable future and tells me that he was only visiting this country to meet a relative.

ATTITUDE TO THE OFFENCE:

Mr. Raja tells me that he is pleading not guilty to the charges therefore I am unable to make further comment.

CONCLUSION

During the three interviews with Mr. Raja he impressed me as a highly intelligent and articulate man, well able to converse in the English language. He was polite and somewhat withdrawn when I first met him. His polite manner remained when we subsequently met but as time progressed he became less reserved perhaps as he became more clear of my role. He clearly gives a great deal of thought to ideological matters, cares deeply for his country of Kashmir and is as a consequence politically motivated. In view of Mr. Raja's plea, I can make no comment about the alleged offences and consequently no recommendation as to disposal at this stage.

N. Proper(Mrs.)
Probation Officer

Homeless Offenders Uni
11/15 Lower Essex Street
Birmingham B5 6SN

NP/VM

021-22-325

9th February 1985

**THE FOLLOWING LETTER PUBLISHED IN THE
ESTEEMED BRITISH DAILY GUARDIAN LED
MANY BRITISH PARLIAMENTARIANS, HUMAN
RIGHTS GROUPS AND MEDIA TO SUPPORT MY
RELEASE:**

“Tried by the courts but sentenced by politicians.”

I was sentenced to life imprisonment in the alleged involvement of the killing of a Birmingham based Indian diplomat kidnapped by a group of Kashmiris in 1984. The trial judge had told me that the Home Secretary would disclose mhe refused to do until after challenged in the London High Court.

We now know that the trial judge recommended 15 years. About nine years later, the Lord Chief Justice recommended 21 years, which has now been extended by the Home Secretary to 25 years!

I wonder how a country can claim to have an independent judicial system, where the judges are so outrageously overruled by politicians who don't know when the political wind might throw them out of their offices. What sort of system is it when the same person, on the same charge, is sentenced three different times, by three different institutions, for three different terms?

At least one has a right to ask what is the point to have so costly courts if their decisions can be brushed aside by politicians for their own political reasons?

Quayyum Raja
HM Prison Long Lartin
Evesham, Worcs
Guardian 0.6.09.1993

Despite my arduous years in British jail, I am impressed of the British wisdom, discipline and self respect. A letter from a former British member of Parliament Dr. Brian Iddon to me is just one such example:

Dear Quayyum

When I retired in 2010 and disposed of all my files (we were dealing with 10,000 open cases at peak) I kept 10 of the most interesting files (some of the largest too!) back for further consideration in a box. My original Parliamentary Office Manager, Karen, is still in that office, now working for my successor Yasmin Qureshi MP, who was a British Pakistani barrister before her election to Parliament in 2010. She has guarded this special file in all that time but the time has come, as I approach the age of 80, to make my final decisions. Originally (according to our Data Protection Act) we asked people if we could shred their files (closed cases were shredded in any case) or pass them on to Yasmin, or whether they would like us to send them to their home address or the address of a solicitor.

Obviously, some of the files have a wider general interest - in your case the problems of uniting Kashmir following the Indian attempted take over of the whole of Kashmir, which resulted in its partition of today. Your case, like another one that I dealt with, had an interesting story to tell about the setting of tariffs in Britain, and we revealed the caution that the British Government exercised in dealing with your case regarding the impact of any decisions on the extremely sensitive issue of India-Pakistan tension over Kashmir (both nations being nuclear powers, of course). I have always felt that your file should be preserved but you may have a different opinion?

It would be extremely difficult to return your file to you in Kashmir - it is massive file and weighs quite heavily. In any case, if someone from Bolton attempted to bring it to

you, it might be examined and cause difficulties for that person at an airport, for obvious reasons. Using the post, would be equally difficult. The alternatives then are either to shred it (that would take some time but is possible) or to archive it in the Bolton Archives at our Central Library.

If you chose to take the latter route, then it could be either be classed as an open file (i.e., immediate access by any interested person) or locked down for periods of up to 100 years. Soon I will be calling for a meeting with our archivist in order to discuss the 10 remaining files (including yours)- I have already established that a file on the misuse of drugs should end up in my archived files at the Wellcome Trust archives in London where my work as chair of the Misuse of Drugs All Party Parliamentary Group and on euthanasia/assisted suicide (as chair of the National Care Not Killing Alliance - CNK) are kept. Some files are about general issues and will be archived without recourse to contacting those involved. When files are archived in Britain they are listed on National databases available online- so that researchers can have access to them.



Author

In 1983 I trained as an acupuncturist and soon afterwards trained as a counsellor. I have always been passionate about understanding human beings, myself included, and in particular understanding humanity. I am a British lady and have one daughter.

I will always remember the first time Quayyum Raja and I met after all the rigmarole that is entering a Category A prison. He was waiting for me to arrive before leaving immediately for his brother's funeral. It was a seminal, human, connecting moment. My 21 years old brother had died thirteen years earlier. I was a member of Community Building in Britain and Quayyum had contacted the person whose name was given in connection with Scott Peck's book *The Different Drum*. I believe that person was afraid to visit a 'prisoner' and so passed the contact on to me. I was curious to meet the person convicted of an offence that had resulted in being incarcerated. I was curious to know what had drawn him to Scott Peck's work and then to reach out.

I found Quayyum, in our many subsequent visits, to be a deeply humane, loving, kind, gentle man with a good sense of humour. I never asked if he had committed the offence that had led to his imprisonment, and perhaps that was naive of me, I